جلد ۱۰۹ مئی ۱۹۸۸ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۹ | مئی ۱۹۸۸ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ | عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ——— ۳۲۴۴۶۸

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

قیامت کی ایک لہر

اسلام آباد راولپنڈی پر جو قیامت گزشتہ اتوار (۱۰ اپریل ۱۹۸۸ء) کو پونے دس بجے سے لگ کر کئی گھنٹوں تک گزری۔ اس کی اخباری تفصیلات اور ٹیلی وژن کے دکھائے ہوئے مناظر اور خبرناموں کے باوجود، حقیقی طور پر یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ کیا کیا کچھ ہوگیا۔ موت، آگ، خون، دکھ، کرب، چیخوں، بے چینیوں، بدحواسیوں، اعصابی تناؤ اور ذہنی دھواں دھاری کے کیا کیا احوال انسانوں کی ایک بڑی تعداد پر گذر گئے۔ اور عمارتیں، گاڑیاں، اسباب آرائش اور دولت کے انبار کس طرح وقت کی بھٹی میں جل گئے۔ یوں سمجھیے کہ عذاب کی ایک لہر تھی جو انسانی زندگی کو ڈبوتی اور اچھالتی گذر گئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دکھایا کہ وہ چاہے تو حفاظت کے ذرائع کو تباہی کے ذرائع بنا کے رکھ دے۔ تقدیر نے ہمیں ذرا سا چونکایا کہ دولت کی تونس، حرام کمائیاں، عیاشی و فحاشی، محبت جاہ اور شریعت سے گریز کرتے کرتے کا توہین آمیز طریق ہمیں پل بھر میں کیسے کیسے حالات سے دوچار کرسکتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اور ساری قوم کو معاف کرے اور اس کے اکابر کو بھی خدا سے معافی طلب کرکے اصلاح پذیری کی توفیق دے۔

اس وقت کوئی ایسی بیان بازی جس سے اپنی اپنی پسند کا سیاسی پروپیگنڈا کرنا مطلوب ہو، ہرگز مناسب نہیں۔ اس وقت تمام لوگوں کو مصیبت زدگان اور ساری قوم کے ساتھ پوری پوری ہمدردی کرنی چاہیے، جن کی جانیں گئیں ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنی چاہیے۔ جو زخمی ہیں ان کی صحت وعافیت کے لیے سوال کرنا چاہیے اور جو بیوائیں اور یتیم اور عام بچے اور بوڑھے یا خواتین بے سہارا رہ گئی ہوں ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے ان کا خاص کرم طلب کرنا چاہیے۔

نیز جس اخلاقی مضبوطی اور صبر و عزم کا مظاہرہ اسلام آباد/راولپنڈی کے عوام نے کیا ہے وہ ایک بڑی طاقت ہے، خدا اس طاقت میں اضافہ کرے اور ساری قوم کو مصائب کے مقابلے میں ایسا ہی جذبۂ مردانہ عطا کرے۔

نہایت ضروری کام یہ ہے کہ مختلف شہروں میں امدادی فنڈز اور دواؤں اور خون کے عطیات جمع کرنے کے انتظامات کر کے مصیبت زدہ بھائیوں کو پورا پورا سہارا پہنچایا جائے۔ وہ یہ محسوس کریں کہ ساری قوم پشاور سے کراچی تک ان کے ساتھ ہے۔ اس معاملے میں کوئی تفریق و تقسیم اور کوئی عصبیت حائل نہیں ہونی چاہیے۔

ہم سب ایک ملت ہیں۔ ہم دشمنوں کے درمیان گھرے ہیں۔ اس وقت خاص طور پر روس اور بھارت اور اسرائیل کی تیوریاں ہمارے خلاف چڑھی ہوئی ہیں۔ ڈپلومیسی کی عالمی بساط پر تیزی سے مہری بازی ہو رہی ہے اور ہمارے اردگرد انتہائی جدید اسلحہ جمع ہو جانے کے علاوہ ایسی واضح جارحانہ چالیں چلی جا رہی ہیں کہ ہم ایک لمحہ کے لیے پلک بھی نہیں جھپک سکتے۔ اس وقت اتحاد، باہمی یگانگت اور مضبوط حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔

خدا ہمارا حامی و ناصر ہو اور وہ ہمیں نظامِ اسلامی کی منزل تک پہنچائے۔ آمین!

کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

چوہدری محمد اشرف باجوہ بھی جدا ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

دارالاسلام پٹھانکوٹ سے لے کر منصورہ تک میں نے اس مردِ سروقامت کے چہرۂ روشن کو ہر مرحلہ میں اپنے ساتھ ساتھ دیکھا۔ کم سخن مگر صداقت بیان۔ خواہ مخواہ کی تقریر بازیوں اور نکتہ آفرینیوں کے بغیر کام کی بات اجمال سے کہہ دینا اور تنقیدی یا اختلافی بات کرنی ہو تو بڑے ٹھہراؤ سے کر دینا، یہ ان کے کمالات تھے۔

اس پورے عرصۂ ربط میں میں نے نہیں جانا کہ ان کی طرف سے کسی کو اذیت پہنچی ہو بلکہ منصورہ کی قریبی رہائش کے بعد تو مزید اسرار و رموز کھلے کہ یہ شخص تو دوسروں کی خدمت سے خوشی حاصل کرتا ہے۔ اور آج یہ حقیقت بھی مجھے تحیر کے ایک چکر میں ڈالے ہوئے ہے کہ چوہدری صاحب مرحوم نے جماعت یا کسانوں کے لیے کام کرتے ہوئے نہ کبھی کوئی معاوضہ لیا اور نہ سفر خرچ۔ وہ رتبۂ بلند الگ کہ دین اور انسانیت کے لیے مسلسل انفاق کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ملایئے، تہجد اور اشراق اور چاشت کے نفل، اور پھر سوچیئے کہ آج کرداروں کے کتنے آئینوں میں اسلاف کا اتنا پتہ تو رہ گیا ہوگا۔ حق یہ ہے کہ صفِ اوّل میں چوہدری صاحب جیسے دس پانچ افراد ایسے تھے جن کی برکت سے ہم تمام لوگ نظریہ نصب العین اور رزقِ حلال اور صدقِ مقال اور جہاد و دعوت کی راہ پر مضبوطی سے قائم رہے۔ یہ قیمتی لوگ جب ایک ایک کر کے اٹھنے لگے تو اندیشہ ہوا کہ کہیں ہمارا مخصوص رنگ اڑنے نہ لگے۔ اشرف صاحب کے رخصت ہونے کے بعد دل اور بھی مضطرب ہوگیا ہے۔ مگر اصل دارومدار تو خدا پر ہے۔ وہ ہے تو دین بھی قائم اور داعیانِ دین بھی سلامت!

چوہدری اشرف باجوہ صاحب کی قدر میری نگاہ میں اس لیے بھی بہت بڑھ گئی کہ اُن کے گھر کی فضا بہت اچھی ہے۔ اور ان کے جوان صاحبزادے ایسے حلیم اور متواضع اور خوش اخلاق ہیں کہ انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیسے شخص کی شفقتوں اور توجہات نے ان کو سانچے میں ڈھالا۔ اب یہ بچے باپ کے مشن کا علم بلند تر کریں گے۔ یہ ایک اچھا باغ انہوں نے میراث میں چھوڑا ہے جو ہر سال ثواب کے پھل اُن کو دیتا رہے گا۔

چوہدری محمد اشرف باجوہ ۱۹۲۳ء میں تلونڈی میں پیدا ہوئے ۱۹۴۳ء میں زرعی کالج لائل پور سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور ساتھ ہی بطور انسپکٹر زراعت ملازمت کا آغاز کیا۔ ملازمت کے دوران ہی میں مولانا مودودیؒ سے رابطہ ہوا اور دارالاسلام پٹھانکوٹ جاتے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں ملازمت چھوڑ کر صادق آباد میں اقامت اختیار کی اور جماعتِ اسلامی کے رکن بن گئے۔ صادق آباد کی غلہ منڈی میں کاروبار بھی کیا جو اب تک جاری ہے۔ مسجدیں بھی بنائیں اور مدرسے بھی چلائے۔ نیشنل گارڈ ضلع رحیم یار خاں کے اہتمام سے جہادِ کشمیر کے محاذ پر سات آٹھ ماہ تک خدمات انجام دیں۔ کاشتکاروں کے ایک وفد کے ساتھ چین کا مطالعاتی دورہ کیا۔ وہ صدر کسان بورڈ پاکستان بھی تھے۔ مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ جماعت اسلامی پاکستان کے ممبر بھی۔ پاکستان زرعی تحقیقاتی کونسل، پاکستان زرعی تحقیقاتی سنٹر، پاکستان ایگریکلچر پرائس کمیشن، ٹوبیکو بورڈ، رائس بورڈ وغیرہ اداروں میں کاشتکاروں کی نمائندگی کرتے رہے۔

۲۲/۳/۸۸ کو کمزوری محسوس کی، ۴/۴/۸۸ کو منصورہ ہسپتال میں داخل ہوئے، ۶/۴/۸۸ کو شیخ زید ہسپتال میں منتقل ہوئے اور ۹/۴/۸۸ کو سفرِ دارالبقا پر روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو رحمت و مغفرت سے نوازے، ان کے گھر والوں اور تمام اہل خاندان کو نہ صرف صبر دے، بلکہ مرحوم کا سا جذبۂ خدمتِ دین و انسانیت عطا کرے، وہ ان کے بچوں کو ان کی جدائی کے صدمے کی تلافی کے لیے اپنی خاص نوازشات سے حصہ دے۔ آمین!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(۲)

(ماہِ مارچ میں پہلی قسط دی گئی تھی)

میں کچھ آگے چلنا چاہتا ہوں مگر موضوعات اور معلومات چاروں طرف سے ایسے سر اُٹھا رہے ہیں جیسے شجرۃ الزقوم کے سر، سینگ اور کان - کچھ معلومات حافظہ سے اُبھرتی ہیں اور کچھ باہر سے برستی ہیں - ان کی وجہ سے تسلسلِ بیان کو قائم رکھنا مشکل ہو رہا ہے - مگر بہر حال یہ بنیادی تسلسل قائم ہے کہ ہم اسلامیت کی راہ کی مزاحمتوں کا جائزہ لے رہے ہیں -

ایک قصہ تو اسرائیل کا ہے جس نے یہ اعلان کر کے مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کو پھر چونکا دیا ہے کہ وہ اسٹنگر میزائل کو تباہ کرنے کے لیے سعودی عرب پر حملہ کرے گا - عراق میں پہلے اس نے اٹامک سنٹر تباہ کیا - پاکستان میں ایسی کارروائی کے لیے اپنی تخریبی و تاریک ذہانت کے ساتھ وہ اپنی نوعیت کی نوخیز قوت بھارت سے ساز باز کر رہا ہے - اب سعودی عرب کو بھی نشانہ بنانے کے ارادے سامنے آ گئے ہیں - مطلب کیا ہے ؟ مطلب یہ کہ ایک تو کسی مسلمان ملک اور قوم کے اندر سائنسی یا دفاعی قوتوں کا نشو و نما نہ ہونے دیا جائے ورنہ یہ آبادی اگر تخریبی شعور سے بہرہ مند ہو گئی تو موجودہ ترتیب عالم کو ہلا دے گی - کسی مسلمان ملک یا آبادی کو گھٹنوں تلے دبا کے نہ رکھا جا سکے گا - قرضوں کے پھندے گردنوں میں ڈال کر اُن کو گھسیٹا نہ جا سکے گا - اور ان کی زمینوں اور علاقوں پر مجرمانہ قبضہ جما کر اصل آبادیوں کو بہیمیت کے ٹینکوں کے نیچے

کچلا نہ جاسکے گا۔ اشارات لکھ چکنے کے بعد یہ ذلیل حرکت سامنے آئی کہ اسرائیلیوں نے ابوجہاد کو قتل کر دیا۔

اس وقت اسرائیل اس نئی مقاومتی لہر سے گھبرا اٹھا ہے جو اسرائیل کے اندر، عرب مسلمانوں کی طرف ۔۔۔ اسلامی اسپرٹ کے ساتھ اس شان سے اٹھی ہے کہ سرفروش جانیں دے دے کر اپنی لاشوں سے صہیونیت کے سیلاب کے آگے بند بناتے ہیں۔ وہ آگے بڑھتا ہے تو لاشوں کا نیا بند آجاتا ہے، پھر اور، پھر اور۔ یہ تجربہ اسرائیل کو پہلے کہاں ہوا تھا۔ اور یہ تجربہ کہ بالکل نہتے لوگ، بوڑھے، بچے، عورتیں پولیس اور فوج کے مقابل میں پتھر اٹھائے نکل آتے ہیں۔ بے تحاشا مرتے ہیں مگر کسی صہیونی کا کلہ توڑ کر اور کسی کی آنکھ پھوڑ کر۔ جوابی کارروائی کا حال یہ ہے کہ کسی بھی راہ چلتے مسلم عرب کو پکڑ کر اسرائیلی سپاہی ڈنڈوں سے پیٹنے لگتے ہیں، ہڈیاں توڑ دیں گے، جسے چاہیں گولی مار دیں گے، گرفتار کر کے مارتے پیٹتے کہیں لے جائیں گے۔

اور ع اس راہ میں مائیں چیختی ہیں، اس راہ میں بچے مرتے ہیں۔

ذرا آپ صہیونیوں کے مشہور گورو گھنٹال ڈاکٹر ہنری کسنجر کا ایک جملہ سنیں جسے اس نے امریکہ کے جیوئش کمیونٹی کے ۸ سرکردہ لیڈروں کی ایک نشست میں پرائیویٹ سطح پر ناشتہ کرتے ہوئے کہا:

> میڈیا کو ختم کر دو، عربوں کی تحریک کو کچل دو، جتنا جلدی ممکن ہے، پورے غلبے کے ساتھ، شدید ستم گاری کے ساتھ، اور بہت تیزی کے ساتھ۔

بعد میں کہا کہ نرم رویہ اختیار کرنے میں کوئی افادیت نہیں۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ یہ تو محض ناشتے پر اس کے عندیے کا بہت ہی چھوٹا سا حصہ ہے۔

دیکھیے یہ شخص جو تہذیب حاضر کے خاص فرزندوں میں سے ہے، جو نازی جرمنی سے بچ کر نکلا ہوا ایک پناہ گیر ہے۔ وہ یہ ذہن رکھتا ہے کہ ایک تو قوت حق ہے اور دوسرے شرافت اور تہذیب کے جو بھی تقاضے ہو سکتے ہیں، وہ اوروں کے لیے ہیں، مسلمانوں اور عربوں کے لیے نہیں ہیں۔

اسرائیل کیا ہے، مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا قائم کردہ ایک "تھانہ" ہے۔ تھانیدار

جو چاہے کرتا رہے، نہ داد نہ فریاد، نہ دلیل نہ وکیل!

ہر بڑی قوت نے اپنے آگے آگے پائلٹ قوتیں چلا رکھی ہیں۔ بڑے سامراجی ممالک جو کام براہ راست نہیں کر سکتے وہ اپنے ان کارندوں سے کراتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں کے جاگیرداروں کا نظامِ کار ہے۔

اسرائیلی حکومت اور فوج اور پولیس کی وحشیانہ کارروائیوں کے خلاف خود یہودیوں کی طرف سے صدائے احتجاج بلند ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ایک تو ظلم حد سے گذر گیا ہے، دوسرے حالات کی ساری خرابیوں کے باوجود انسانیت ابھی اتنی مری نہیں کہ معاشرے میں اس کی مرے سے کوئی آواز ہی نہ اٹھے۔ یہ آواز تو اب روس کے سوویٹ گل گھوٹو نظام میں بھی طرح اٹھی ہے کہ پنجابی کہاوت کے مطابق اول تو مردہ بولے ہی نہیں، ورنہ اگر بول پڑے تو چھت ہی پھاڑ دکھائے۔ اسرائیل میں بھی خود یہودیوں نے صہیونی مظالم کے خلاف ایک چیخ ماری ہے۔

اسرائیل کا دوسرا کارنامہ بیان کرتے ہوئے تمہیداً چند الفاظ یہ کہہ دئے جائیں کہ پاکستان یا مسلمانوں یا کسی مسلم ملک یا کسی مسلم شخصیت کو کہیں سے کوئی فائدہ پہنچنے یا امداد ملنے یا کسی ضرورت کے پورا ہونے یا کوئی مفید تجارتی یا دفاعی معاملہ کرنے کا کوئی موقع پیدا ہو تو غالب صہیونی تمام یہودیوں کو ساتھ ملا کر اس میں رکاوٹ ڈالنے کی آخر دم تک بھرپور کوشش کرتا ہے۔ خصوصاً مغربی ممالک اور ان میں سے بھی درجہ اول پر امریکہ سے جب کبھی ہمارا کوئی معاملہ شروع ہوتا ہے تو بھارت اور اسرائیل دونوں (جاگیردارِ امریکہ کے مزارعے) ہمارا راستہ روکنے کے لیے پریس، سینیٹ، کانگریس اور قصرِ صدارت، سبھی دائروں میں یلغار کر دیتے ہیں۔

یہی مکروہ صورت آج ایک معاملے میں سامنے آتی ہے۔ "ٹمپلیشن فاؤنڈیشن" نامی دارے نے مذہبی ترقی کے لیے ایک انعام مختلف مذہبی شخصیتوں اور اداروں کو دینے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اب تک یہ انعام رومن کیتھولک، پروٹسٹنٹ، راسخ العقیدہ روسیوں، ہندوؤں اور بدھوں کو ملتا رہا ہے۔ پہلی مرتبہ مذکورہ ادارے نے یہ انعام ڈاکٹر انعام اللہ خان سیکرٹری جنرل موتمر عالم اسلامی کو دینے کا اعلان کیا ہے۔

اب تل ابیبی اسرائیلیوں سے لے کر نیو ہیٹنی صہیونیوں تک تلملاہٹ کا ایک طوفان

اُکھڑا کھڑا ہوا ہے ۔ وہ لوگ متذکرہ فاؤنڈیشن کے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ اس نے یہ انعام سامیوں کے ایک نسلی مخالف (ANTISEMITIC) کو کیوں دے دیا ہے[1]۔ پریس میں انہوں نے اودھم مچا دیا ہے اور خطوط اور ملاقاتوں کا سلسلہ نہ معلوم کہاں سے کہاں تک ہے ۔ دراصل یہودیوں نے ہر اس مسلمان شخصیت یا ادارے کا ریکارڈ رکھا ہوا ہے اور اس کے بارے میں معلومات جمع کی جاتی ہیں جو اہمیت اختیار کر جائے اور خصوصاً بین الاقوامی دائروں میں قدم آ رکھے ۔ سو یہ قصور تو انعام اللہ خاں پہ ثابت تھا ۔ ان کا ریکارڈ کہتا ہے کہ ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب نے مخالف سامی لٹریچر پہ بڑا روپیہ لگایا ہے ۔ پھر اس لٹریچر کی تفصیل بھی پریس میں آگئی ہے جو کراچی سے لے کر امریکہ کے سینیٹروں، کانگریسیوں اور ایک ہزار برطانوی ٹریڈ یونینوں وغیرہ تک ارسال کیا جاتا رہا ہے ۔ (یہودیوں کی معلومات پہ ہر آدمی حیران رہ جاتا ہے) ۔ اب زور اس پہ ہے کہ فاؤنڈیشن اس انعام کو منسوخ کر دے ۔ دیکھیے! کیا ہوتا ہے ۔ اگر صہیونی کامیاب رہے کہ پھر خاں صاحب بجائے خود اللہ کا انعام ہی ہیں ۔ انہیں کسی اور انعام کی کیا احتیاج ؟

اب سر جھکا کر سوچیے کہ ہمارے گرد کس کس سانپ نے کنڈلیاں ڈالی ہوئی ہیں اور ہر ایک کے چکر کتنے کتنے ہیں ؟

ٹوٹے ہوئے سلسلۂ عبارت (مارچ اور اس کے بعد کے لیے جو کچھ لکھا) اس کی کڑیوں کو جوڑنے سے پہلے ایک اور قصہ جسے آنا تو پہلے چاہیے تھا، مگر اب سامنے آیا تو میں نے

---

[1] واضح رہے کہ جب کبھی مسلمانوں کی طرف صہیونیت اور اس کی مسلّم آزادی پر کوئی آواز اٹھتی ہے تو اُسے مخالفِ سامیت قرار دے کر ..... نسلی تعصب کا ایک مسئلہ بنا دیا جاتا ہے اور اس سوال کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا جاتا ہے کہ حق، ناحق کیا ہے اور ظالم مظلوم کون! یہ صہیونیوں کے مخالفِ مسلم پروپیگنڈے کا بڑا ہتھیار ہے، مگر یہ ہتھیار بھی سچ کی دھات سے نہیں بنا، اس کی دھات بھی کھوٹی ہے ۔ سارا جھوٹ کا کھیل ہے ۔

شامل کر لیا۔ نظامِ تعلیم پر کچھ بحث ہم نے مارچ میں کی تھی۔ اس کا ایک اور وضاحتی پہلو ہے
ہمارے عزیز دوست عزیز مرزا جو ایک طرف وسیع معلمانہ تجربہ رکھنے والے قابل ناشر
ہیں اور دوسری طرف مروجہ نظامِ تعلیم اور نظامِ مدارس اور خصوصاً مشنری تعلیمی مساعی
اور باہر سے چھپ کر آنے والی نصابی کتابوں کا تفصیلی جائزہ لے رہے ہیں اور سارا مواد
جمع کر کے شاید وہ ایک ٹھوس شکل میں سامنے لائیں۔ انھوں نے مجھ سے گفتگو میں کرنے
کے علاوہ اپنی معلومات، مواد اور جمع کردہ اعداد و شمار کی ایک جھلک ایسی دکھائی کہ اب
میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ بیرونی ملحدانہ تہذیب اور بیرونی زبان کی جو بیڑیاں ہمیں پہنائی
جا رہی ہیں اُن سے آزاد ہونے کی راہ کیا ہے اور ان سے آزاد ہوئے بغیر ہم اسلام کے لیے
اس معاشرے میں کوئی بڑا کام کر کے کوئی ہمہ گیر تبدیلی کس طرح لا سکتے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں کہ
ہمارے ذہن اسیرِ قفس ہیں بلکہ زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ ہم نے تو اپنی نسلوں کو اغیار کے ہاتھوں
میں گروی رکھ دیا ہے اور جہاں کہیں اپنے آدمی کام کرتے دکھائی دیتے ہیں وہ تو اغیار ہی کا
کام کر رہے ہیں — وہی ذہن، وہی نصاب، وہی تصویریں، وہی رنگ، وہی زبان —
اور اس ملک گیر گردابِ تعلیم میں ہمارا اپنا سب کچھ غرق ہوا جا رہا ہے۔ ہر غرقابی کے بعد
کچھ بلبلے اٹھتے ہیں اور پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ میں تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ ہم عہدوں
اور تنخواہوں کے عوض اپنی اولادوں کو اسی طرح قسائیوں کے حوالے کر رہے ہیں جیسے
ہر روز ہر شہر کی بکرمنڈی میں بے شمار گردنیں چھریوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ ہم جادو
کے اس دریا میں جو ہمارے آگے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں بہہ رہا ہے۔ اپنے ایک ایک
بچے کو اٹھا اٹھا کر پھینکتے ہیں اور جو جتنا زیادہ ڈوب جاتا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے
ہمارا بیڑا اتنا ہی جلد پار ہو گا۔ ہم وافر سکوں اور نوٹوں اور معیارِ زندگی اور آسائشات
کو حاصل کرنے کے لیے اپنی اولاد کے ساتھ اپنے ایمان، اپنے عقیدوں، اپنے فریضۂ دعوت
اپنے جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ، اپنے جنونِ جہاد برائے حق اور اپنی نمازوں، روزوں اور
پردے اور شرم اور غیرت اور روایات اور اقدار سب مادہ پرستی کی آگ میں جھونک رہے
ہیں جو زمانے نے ہر طرف بھڑکا رکھی ہے۔

ہمارے یہاں حکومتی اور نیم حکومتی انتظام میں چلنے والے تعلیمی اداروں کی اقسام یہ ہیں:
۱۔ عام گورنمنٹ پرائمری، مڈل، ہائی اسکول۔ ۲۔ پرائیویٹ سیکنڈری سکولز۔
۳۔ گورنمنٹ کمپری ہنسو اسکول۔ ۴۔ پنجاب میں ۳ سنٹرل ماڈل اسکول۔ ۵۔ ڈویژنل پبلک اسکول۔ ۶۔ وہ پبلک اسکول جن کے بورڈ آف گورنرز کی صدارت گورنر صوبہ پنجاب کے پاس ہے (مثلاً ایچی سن کالج) ۷۔ کنٹونمنٹ بورڈ اسکول۔ ۸۔ بلدیاتی اداروں کے تحت چلنے والے اسکول۔ ۹۔ بلدیاتی اداروں کے تحت چلنے والے جونیر ماڈل اسکول۔
۱۰۔ حکومت کے تحت چلنے والے جونیر ماڈل اسکول۔ ۱۱۔ کیڈٹ اسکول۔ ۱۲۔ نیشنل ٹسٹرڈ اسکول۔ ۱۳۔ پروونشلائزڈ اسکول۔ ۱۴۔ سوشل سیکوریٹی اسکول۔

نظام مدارس کی یہ رنگارنگی اور ان میں درجہ بندی معاشرے کے طبقاتی انتشار کی آئینہ دار ہے۔

اِن سب پر تفصیلی گفتگو ممکن نہیں۔ ہم ایک ہی قسم کو لیتے ہیں۔ جن کی چھاپ مقبول ترین ہونے کی وجہ سے مختلف اداروں پر مختلف درجوں میں اثر انداز ہے — یہ ہیں:

ST. JOSEPH ، ST. MARY ، ST. ANTHONY ، SACRED HEART.

اور کیتھیڈرل نام کے بہت سے ادارے جو عیسائی مشنری کے قائم کردہ ہیں۔ یہ ادارے اس تصور پر قائم کیے گئے ہیں کہ برصغیر میں بسنے والی اقوام غیر مہذب اور تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ ہم انہیں تہذیب اور تعلیم سکھانے پر مامور ہیں۔[1] یہ ادارے بیرونی مشنریوں کی مالی امدادوں پر اور عیسائی حکومتوں کی سرپرستی میں اور سمندر پار کے چھپے ہوئے لٹریچر کی مدد سے ملحدانہ کلچر کو عیسائیت کا رنگ دے کر اُسے پھیلا رہے ہیں اور شاخ درشاخ کتنے ہی کیتھیڈرل قائم ہیں۔

---

[1] ترتیب اُلٹ گئی۔ پہلے مسلمان دنیا کو علم اور تہذیب کی نعمتیں عطا کرنے والے تھے، اور محتاجوں میں خود یورپ شدید ترین محتاج تھا۔ اب مسلمانوں کو علم اور تہذیب سکھانے والے اغیار ہیں۔ ہم نے اپنی سابق پوزیشن سنبھالنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ آج ہم دُنیا میں علم و تہذیب کے اوّل درجے کے گداگر ہیں۔

نصاب کی بالکل ابتدائی انگلش کتابوں میں عریاں رانوں کے ساتھ ایک لڑکی اور مغربی لباس میں ایک لڑکا، بار بار ان کے عیسائی نام اور بار بار ان کی تصویریں، پھر ایک کتا، بار بار کتا مختلف حالتوں میں، پھر نام لیے بغیر کرسمس ٹری، ایک سے زیادہ بار ــــ نہ محمد مصطفیٰؐ کا ذکر، نہ مسجد کی تصویر، نہ قرآن کی کوئی آیت ــــ تاریخ اور جغرافیہ بھی اگر مذکور ہوا تو یوں کہ ایک باب کا عنوان ہے:۔

"IRRIGATION SYSTEM DURING TUDOR DYNASTY"

یعنی ٹیوڈر بادشاہوں کے زمانے کا نظامِ آب پاشی جس کا تعلق انگلینڈ سے ہے۔

اب ذرا ان مدارس کے ماحول کی ساحری کا اندازہ ان الفاظ میں کیجیے:

اِس نصاب کے ساتھ ان اسکولوں کی پُروجاہت عمارتیں، طلبا کی محدود تعداد کے لیے کشادہ کلاس رومز، طویل راہداریاں، کامن رومز، آڈیٹوریم، تھیٹر، تیرنے کے حوض، جسمانی تربیت کے لیے جمنیزیم، کھیلوں کے سرسبز گراؤنڈ، رہائش کے لیے باوقار ہاسٹل اور ان میں مامور خدام، یہ سب مراعات بچے کو ہر وقت یہ احساس دلاتی ہیں کہ وہ اہم ہے۔ مشن اسکولوں میں فادر کا پُرنور چہرہ، سفید ڈاڑھی، سفید لباس، گلے میں صلیب کا نشان اور راہبات کے جھمگھٹے [1]

---

[1] ان کے بالمقابل بچہ جب محلے یا گاؤں کی مسجد کے امام صاحب کی مفلوک الحالی اور ان کے میلے لباس کو دیکھتا ہے تو اندازہ کر لیجیے کہ اس کے دل میں اپنی اقدار و روایات کا کونسا درخشاں تصور پیدا ہوگا۔ اور ان سے اس کو کیا وابستگی پیدا ہوگی۔

علاوہ اس کے (MASS EDUCATION) کے لیے حکومتی یا تجارتی یا رفاہی یا با گروہی ادارے جو چل رہے ہیں۔ ان میں بچوں کی بھرمار ہے ــ ایک ایک کلاس روم میں سو سو نسبچے بیٹھتے ہیں۔ فرنیچر، تجربہ گاہوں اور دیگر تعلیمی سہولتوں کا فقدان ہے، کھیل کے میدان ناپید ہیں۔ اساتذہ بالعموم معیارِ مطلوب سے فروتر ہیں۔ بچہ اول روز سے عدمِ توجہی (باقی بر صفحہ آئندہ)

اِن اداروں کو ہمارے ہاں کے نظامِ امتحانات سے بھی بالاتری حاصل ہے۔ اور محض اس وجہ سے یہ جو کچھ بھی جس طرح چاہیں پڑھاتے سکھلاتے رہیں۔ یہاں سے مؤثر مداخلت نہیں کی جاسکتی۔ یہ بے شمار آزاد جزیرے ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی کے سمندر میں ہم سے تعلیمی و تہذیبی اختلاف رکھنے والوں نے تعمیر کر لیے ہیں۔

دردناک حقیقت یہ ہے کہ کئی پبلک سکول اور کالج ایسے ہیں جن میں ہمارے بعض لیڈروں کے خصص ہیں، یا وہ ڈائریکٹر ہیں یا صدر ہیں یا مہمانِ خصوصی بن کے جاتے ہیں۔ اور اپنی سرپرستی میں ان کو نوازنے کے ساتھ انعامات یا اسناد تقسیم کرتے ہیں۔ اس وقت باہر کے چالاک شکاری دل ہی دل میں کہتے ہوں گے، کس خوبی سے ہم نے ایک قوم کی قوم کو الو بنایا۔

اب یہ ادارے جو ہر سال صدہا نوجوانوں کو تیار کر کے (اور کبھی مغربی بلند تعلیم سے گزار کر) ہماری فوجی اور سول بیوروکریسی میں ڈال رہے ہیں۔ اور خاکروب خاندانوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) اور بعض اوقات تشدد کا شکار رہتا ہے۔ وہ کئی وجوہ سے سکول میں سبق کو سمجھ نہیں پاتا۔ گھر کا ماحول مفوضہ کام کرنے کے لیے سازگار نہیں اور نہ کوئی مدد دینے والا ہے۔ ان سارے حالات کی سزا اسے گالیوں، ڈنڈوں، گھونسوں اور مرغا بننے کی صورت میں ملتی ہے۔ مایوسیوں اور ناانصافیوں کی گود میں پروان چڑھنے والے ایسے بچے ہر شعبۂ زندگی میں کام چور، خائن اور اپنے آپ سے خفا اور معاشرے سے بیزار رہتے ہیں۔

گویا ہمارے ہاں کے اس طرح کے تعلیمی ادارے بچوں کو اپنے دین اور ملک سے مایوس اور مشنری اسکولوں اور ان کے رنگ میں رنگے ہوئے اسکولوں اور ان کے نظام اور ان کے مذہب سب کے لیے اپنے اندر ایک مرعوبیت لے کے اُٹھتے ہیں۔ گویا ہم اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تعلیمی محاذ پر ان اغیار سے مار کھا رہے ہیں، جو باہر سے یہاں آکر کام کر رہے ہیں۔ ہائے یہ زنانہ طرز کی شکست! یہ صورتِ حالات بھی گویا ہمارے دین و تہذیب ہی کے لیے نہیں، ملکی استحکام کے لیے بھی تباہ کن ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنے خرچ پہ پڑھا کر بپتسمہ دے کر، اپنے بے شمار تعلیمی اداروں میں معلمانہ مسندوں پہ بٹھا کر بڑے بڑے خاندانوں اور نوابوں اور جاگیرداروں اور جرنیلوں اور وزیروں کے بچوں کو ان کی شاگردی کے سایہ میں دئیے ہوتے ہیں۔ اندازہ کیجیے ایسے معلمین و معلمات کے سماجی مرتبے (STATUS) میں آنے والے انقلابِ عظیم کا۔ "صاحب" کے گھر کموڈ اور گندی نالیوں کو صاف کرتے کرتے بچے اٹھتے ہیں اور اسی صاحب کے بچوں یا نواسوں اور پوتوں کے لیے سر (ماسٹر)، اور مس یا میڈیم بن کر ان کو امریکیوں اور انگریزوں کے ذہن سے جب غیر اسلامی اور غیر پاکستانی تہذیب کے سانچے میں ڈھال رہے ہوتے ہیں تو اس شکل میں گویا مسلمانوں کی دینی برتری اور تہذیبی خودداری کا انتقام لے رہے ہوتے ہیں۔ اور بڑے بڑے خاندانوں کے نادان مسلمان خوش ہو رہے ہوتے ہیں کہ اب ان کی اولادیں ترقی کی راہ پہ پڑ گئی ہیں۔ گویا اس تعلیمی و تہذیبی صلیبی جنگ میں ہم اپنی ملی خودی کے یروشلم کی کنجیاں فاتح صلیبی قوت کے حوالے کر رہے ہوتے ہیں۔ اور اسے کامیابی سمجھتے ہیں کہ ایک پرانا کباڑخانہ دشمن کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔

ان تعلیمی اداروں کی مثال میں کہا جاتا ہے کہ یہ سائنسی ترقی کا ذریعہ ہوں گے۔ انگریزی دور سے لے کر اب تک برابر یہ کام کرتے رہے ہیں۔ بتائیے انھوں نے کوئی سائنس دان پیدا کیا؟ کوئی صاحبِ ایجادات کہیں سے ابھرا ہے؟ کسی نے ملکی استعمال اور مشینی اور دفاعی صنعتوں میں کوئی نیا اقدام کر دکھایا؟ حقیقت میں سائنس کا نام ہی نام ہے۔ اصل میں گرجے، مخلوط سوسائٹی، ننگی ٹانگوں، کھلے بالوں اور انسانی زندگی میں کتوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے علاوہ مناظر سے لطف اندوزی اور خواہشات سے تفریح حاصل کرنے اور حقیقی خدا پرستی، دینداری، عبادات، حدودِ حلال و حرام، اخلاقی بلندی و پستی کے پورے تصورات سے ہماری نسلوں کو دور لے جانا مقصود ہے۔ چنانچہ یہ سب مسیحی اور مسیحیت و مغربیت کی پرچھائیں قبول کرنے والے پبلک اسکول ہم لوگوں کی اولادوں کو ایسے جانوروں میں بدل دینا چاہتے ہیں جو کھانے پینے اور دیگر موانحات میں اندھا دھند مشغول ہوں، دولت کی اتنی تونس رکھتے ہوں کہ خیانت کا رنگ خوب پھیلائیں۔ عورت کو گھر سے نکال کر پردے سے اور بڑی حد تک لباس سے بھی آزاد کر کے

لسے نمائش کاری اور ہوس کاری کے اسٹیج پر لا کھڑا کریں اور مخلوط سوسائٹی اور فحاشی اور عیاشی کے ذریعے تمام اخلاقی احساسات کو تباہ کردیں۔

اگر ایک ہی مہم چلتی رہے تو احیائے اسلام کے خواب کو پریشان کرنا بڑا آسان ہے۔ کجا یہ کہ دسیوں ترکیبیں اور بھی کام کر رہی ہیں۔

دوسری طرف یہ قصہ بھی چھڑ چکا ہے کہ ایک تعلیمی و تہذیبی یلغار اسمٰعیلیوں نے بھی ہمارے دماغ درست کرنے کے لیے شروع کی ہے۔ مدتوں تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ یہ لوگ دوسروں سے تعرض کیے بغیر اور سیاسی مقاصد کو سامنے رکھے بغیر معاشرے میں سیکولر سے خاموش کام کرتے رہے ہیں۔ مگر اب پاکستان پر جو ان کی پُر اسرار توجہ خاص طور پر ہوئی ہے تو لازماً اس کے پیچھے ایک خطرناک منصوبہ ہے جسے ہفت روزہ تکبیر نے واضح کر دیا ہے۔ اس وقت دو بڑے تعلیمی و ثقافتی اڈے ان کی طرف سے قائم ہوئے ہیں۔ جو بظاہر بڑا احسان معلوم ہوتے ہیں کہ پاکستان کی ترقی کے لیے ایک گروہ روپیہ اور قابلیت دونوں کو کھلے دل سے استعمال کر رہا ہے، مگر یہ احساس معصومانہ قسم کے نہیں ہیں۔ ایک طرف ان کے عالمی لیڈر اور پیر آغا خان، امریکہ و برطانیہ کے محبوبانِ خاص میں سے ہیں۔ دوسری طرف ہندو لا مذہبی تا مہنود کے ساتھ ان کا قانون ہے، اور پھر بھارت میں ان کی خاصی آبادی اور بہت بڑے کاروبار بھی ہیں۔ یہ وہاں کے مسلمانوں سے بالکل الگ ایک گروہ ہیں۔ ان کے عقاید توحید و رسالت دونوں کے معانی کو غت ربود کرنے اور نماز کے بجائے اپنے پیر کو سجدہ کرنے اور حاضر امام کو حرام و حلال کا فیصلہ کرنے کا مختارِ کل سمجھتے ہیں۔

اس مذہبیت کے ساتھ اور امریکی، برطانوی اور بھارتی رابطوں کے ساتھ وہ پاکستان پر بہت مہربان ہیں۔ وہ شروع سے بنو اُمیہ کے دورِ حکومت کو اسلام کا شاندار مظہر مانتے ہوئے اور رقص و موسیقی اور آزادیٔ نسواں کی ترغیب دلاتے ہوئے پاکستان کو سیکولرازم کی راہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔ پاکستان میں اپنے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے انہوں نے یہاں بڑی

سخاوتیں دکھائی ہیں۔

اب انہوں نے کچھ تازہ اقدام کیے ہیں۔ پہلے تو کراچی میں میڈیکل تعلیم کا انتہائی معیاری ادارہ اوّل درجے کی سہولتیں کے ساتھ قائم کیا تاکہ نوجوانوں کے بہترین دماغوں کو وہ اپنے زیرِ اثر لے کر چند سال کے دورِ تعلیم میں "درست" کریں۔ تاکہ جب یہ لوگ پاکستان میں بڑی بڑی حیثیتوں کے ساتھ کام کریں تو یہ اور ان کے اقربا سوسائٹی کو سیکولرازم کا شکار بنا کے چھوڑیں۔ دوسری طرف ملکی اداروں کی پستی کا احساس ان میں اپنے ملک اور معاشرے کی محبت کو مجروح کر دے۔ لیکن دوسرا اقدام اس سے بھی بڑا ہے۔ گلگت اور ملحقہ علاقوں میں شیعہ اور سنّی آبادی کا ایک خاص توازن قائم تھا۔ اب اسمٰعیلی ادارے کے قیام سے یہ توازن ٹوٹ جائے گا۔ کیونکہ یہ لوگ بہت روپیہ خرچ کر کے، بہت سہولتیں دے کر اردگرد کی آبادی کی نوجوان قوت کو سمیٹتے جائیں گے۔ جب کہ دوسری طرف پرانی طرز کے ہمارے اسلامی مدارس اور نئی طرز کے متوسط سے مراکز کی طرف رجوع مسلسل کم ہوتا جائے گا۔ غریبی اور جہالت میں پڑے ہوئے لوگوں کو پیسے اور نئی تہذیب کے زور سے رسمی حد تک اسمٰعیلیت کی طرف اور حقیقی طور پر مغربیت اور سیکولرازم کی طرف کھینچا جائے گا۔

اگلے خطرناک پہلو کی وجہ سے بہت پریشانی ہے۔ یہ علاقہ جہاں ایک پُرکشش شاندار اسمٰعیلی ادارہ بنایا گیا ہے اور جہاں پہلے سے شیعہ آبادی موجود ہے۔ مختلف پہلوؤں سے بہت پسماندہ علاقہ ہے۔ یہ پسماندہ علاقہ ایسی جگہ ہے کہ ایک طرف تو بھارت کا اس پر دعویٰ ہے اور دوسری طرف روس کی پہلی زد میں ہے۔ تکبیر کراچی نے اس خطرے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر روس کسی بھی وقت پاکستان پہ نوازش خاص کرنا چاہے (اور چشمِ بد تو اِدھر ہے ہی) تو اس کے لیے جہاں یہ علاقہ بہترین علاقہ ہے، وہاں قائم ہونے والا اسمٰعیلی ادارہ اور بھی بہت مفید ادارہ ہے۔ کمال یہ ہے کہ حکومت کی رائے ہے کہ نہ اس سرحدی (روس کے قریب) علاقے میں ترقیاتی کام ہو سکے، نہ تعلیم عام ہو سکی۔ نہ غربت دور ہوئی اور نہ دفاعی انتظامات کافی ہیں۔ ہم بغیر تصدیق و تردید مشہور عام مبینہ خبر کا ذکر کر

کہہ دیتے ہیں کہ اسمٰعیلی حکومت قائم کرنے کے لیے سکے اور جھنڈے کے نمونے بھی تیار ہو چکے ہیں۔ نہ بھی ہوئے ہوں تو ان کاموں کو انجام دینے میں کیا دیر لگتی ہے۔ ضرورت صرف روس سے ذراسی محبت بڑھانے کی اور فوائد سمیٹنے کی ہے۔

پاکستان واحد ملک ہے جس کی سرحدوں کے خطرناک ترین حصوں پر ایسی آبادیاں ہیں کہ جن کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی آزمائش کے لمحے میں کیا کریں گی۔

ایک طرف صلیبی حملے، ایک طرف زیر سطح قادیانی سرگرمیاں، ایک طرف بعض مسلم اور غیر مسلم اقلیتوں کی کرم فرمائیاں، ایک طرف ڈاکوؤں کا کھیل، ایک طرف کابل حکومت کی ترکتازیاں، ایک طرف واخان میں روس کا بھاری اڈہ، ایک طرف سیاچن کے برف زار پر قبضہ کرنے کے لیے بھارت کی شعلہ افگنیاں ---- اور پھر ایک طرف اسمٰعیلی اسکیم ---- کون کہہ سکتا ہے کہ ان سارے مہروں کے اس طرح بساط پر جمع ہونے کے معنی کیا ہیں؟[۲]

ہمارے ہاں چونکہ لوگ کھانے پینے کے کاروبار میں لگے ہیں۔ ہر کوئی رشوت و خیانت کی اسکیموں پر روزانہ کاوش کر کر کے ان کو عمل میں لاکر فائدے حاصل کرتا ہے اور پھر آگے کا نقشہ بناتا ہے۔ ممبریوں اور عہدوں کی بانٹ، بلکہ خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے، اور لوگ علاقوں اور صوبوں اور زبانوں کے لیے باہم دست و گریباں ہیں۔ اتنے اہم معاملات کے ہوتے ہوئے کس کو فرصت کہ وہ کارِ نماس کے اداروں کے ذریعے ہر چیز کی مخفی حقیقت کو وقت سے پہلے سمجھ سکے اور کس کو اس ضرورت کا احساس کہ وہ اپنے سرحدی علاقوں کو تعلیم اور معیشت اور دفاع کے لحاظ سے مضبوط بنائے۔ اور کس میں ہمت کہ وہ مشتبہ قسم کے غلط کام کرنے والوں

---

۱ اس بحث کی شاید کچھ تفصیلات تعلیمی موضوع سے ہٹ کر آگے بھی دینی پڑیں۔

۲ عجیب بات ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے ہم اکثریت کے ہاتھوں ستم رسیدہ تھے اور اب ہم اقلیتوں کے ہاتھوں الم چشیدہ ہیں۔ گویا اصل خرابی اور کوتاہی خود ہم میں ہے، باہر کی زیادتیاں اور ستم شعاریاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔

کو روک سکے اور مشکوک اداروں کو اگر حکومت کی مستقل نگرانی میں نہ لے سکے تو کم سے کم ان پر بعض ضروری پابندیاں لگا دے۔

مگر جس حکومت کا اپنا کوئی تعلیمی تصور ہی نہ ہو اور کوئی تہذیبی نقشہ ہی نہ ہو، اس کے ہاں تو میدان کھلا ہے کہ جس کا جی چاہے آئے اور جیسی تعلیم و تہذیب چاہے قوم میں پھیلائے، کوئی احتساب اور روک ٹوک اور امتناع نہیں ہے۔ جہاں ۴۰ سال میں دستور ہی کا فیصلہ نہ ہو پایا ہو، جہاں یہی طے نہ ہو کہ کس قسم کی حکومت پاکستان کو چاہیے، جہاں یہی سوال جھگڑے کا باعث ہو کہ شریعت ہو گی یا لادینیت، وہاں کس بنیاد پر کسی اپنے بیگانے کو روکا جائے کہ فلاں کام یہاں کیا جا سکتا ہے، فلاں نہیں کیا جا سکتا۔

ایسی خستہ حالی و بے چارگی اور جمود و جذام کا عالم جہاں طاری ہو، وہاں ہم لوگ اسلام جیسے عظمت مآب نظامِ زندگی کی دعوت لیے اس امید میں کھڑے ہیں کہ شاید دیر صرف اتنی ہے کہ نظامِ اسلام کی معلومات قیادت کے سامنے رکھ دی جائیں تو وہ فوراً انھیں آنکھوں سے لگا کر نافذ کر دے گی۔ پیارے ساتھیو! یہ جو کچھ دیکھتے ہو کٹھ پتلیاں ہیں، گڑیاں ہیں، مومی مجسمے ہیں، یہ جیتے جاگتے آدمی بھی نہیں، تمہیں تو مسلمان چاہئیں!

خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع پر ایک پیراگراف مجھے الگ سے لکھنا تھا، مگر برسبیلِ تذکرہ یہاں بات چھڑ گئی، لہٰذا اسی جگہ چند ضروری نکات عرض ہیں۔ اس کی اصل حقیقت توجہ طلب ہے۔ میں یہاں اس کے بنیادی فلسفے اور اس کے خلاف مغربی مفکرین کے دلائل کو پیش نہیں کرنا چاہتا، اور نہ اس مسئلے کو اپنے دینی اور عقلی نقطۂ نظر سے جانچنا چاہتا ہوں۔ فقط یہ کہنا ہوں کہ یہ مسئلہ اخلاق کے علاوہ بہت سے دوسرے سیاسی و تمدنی مسائل سے تعلق رکھتا ہے دنیا کی اقوامِ غالب کو آبادی کی زیادتی یا وسائل کی کمی کا کوئی قضیہ درپیش نہیں ہے، انہیں ہمدردی صرف نوخیز ایشیائی، افریقی اور خصوصاً مسلم ممالک سے ہے[1]۔ یہ چیدہ اور اچکی قومیں جنہوں

[1] اس میں ایک بڑا [illegible] نقطہ بھی پنہاں ہے۔ مغربی تاجر دیکھ رہے ہیں کہ (باقی بر صفحہ آئندہ)

نے دُنیا بھر کے حصّے کی دولت کچھ تو شہنشاہی دور میں لوٹی کھسوٹی اور کچھ اب قرضوں اور ایڈ کے سامراج ، علمی و ثقافتی سامراج اور ہمیں ترقی کی راہ پر ڈالنے کے بہانے ہماری جیب تراشی کر رہے ہیں ، اندر ہی اندر اس بات سے ڈرتی ہیں کہ اگر پچھلی پسی غریب اور سابق غلام قوموں کی آبادی کثیر کے لشکر کے لشکر ہمارے خلاف اُمڈ پڑے تو یہ تو سب کچھ تباہ کر دیں گے۔[۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

مشرق کی وسیع منڈی کے لوگوں کی قوتِ خرید آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے وہ انہیں سکھاتے ہیں کہ " بچے دو ہی اچھے " کی صورت میں خوب کھاؤ پیو گے اور تیسرے بچے کو روک کر اس پر اُٹھنے والے خرچ سے ٹیلی وژن یا سکوٹر خرید سکو گے اور مجبوری ہوئی تو قسطیں ادا کر سکو گے ۔ پھر چوتھے بچے کو روک کر فرج لے لینا ـــــ نہایت دُور رس فکر کے ساتھ دَورِ نَو کے بنیئے ہمارے ہاں " بچہ روک " تحریک چلاتے ہوئے ہیں ۔ اور اس تحریک کو ہمارے محکمہ ہائے صحت ، ویلیج ایڈ ، تعلیم ، ریڈیو اور ٹیلی وژن اور اخباری اشتہارات کی مدد سے ہماری حکومتوں کے ذریعے " تبلیغ " کرا رہے ہیں ۔ اس کارِ خیر کے لیے فنڈ مہیا کیے جاتے ہیں اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دیہات تک میں خانہ بہ خانہ بھیج کر خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم مردوں اور عورتوں کو ایسے اہتمام کے ساتھ دلوائی جاتی ہے گویا اُن کی دُنیا و آخرت کی بھلائی کا انحصار اسی پر ہے ۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

[۱] ملحدانہ نظریۂ سیاست اور مادہ پرستانہ تہذیب اور مادی اخلاق اور اس کے ساتھ جدید دور کے اسبابِ آرام و تعیش اور ذرائع تفریحات نے بڑی بڑی قوموں کے ماحول کو ایسا بنا دیا ہے کہ ان کے مردانِ جنگی کی قوتوں کا پیمانہ گر گیا ہے ۔ امریکی فوج ویت نام میں کھڑی نہ رہ سکی ، بھاگ نکلی اور اب روسی فوج کے لیے افغانستان دہکتا ہوا بھاڑ بن گیا ہے ، جس میں اس کے سپاہی مکی اور چنوں کے دانوں کی طرح بھُن رہے ہیں ۔ جو زندہ رہتے ہیں وہ کسی اچانک آفت کے خوف میں گھُل گھُل کر ہیروئن اور دوسرے نشوں کی پناہ لینے لگے ہیں (باقی بر صفحہ آئندہ)

ان کے خیال میں ہماری اقوام کی آبادی کثیر ہی بہت سے جھگڑوں، جھمیلوں، انقلابوں اور ہنگامہ خیزیوں کا باعث ہے۔ انہیں اندیشہ یہ ہے کہ اس سیلاب کا آخری نشانہ ہم بھی بن سکتے ہیں خود میرے مطالعہ سے کسی مغربی دانش ور کی یہ بات گذر چکی ہے کہ رنگین نسلوں کے چیونٹوں کا سیلاب اگر ایک دفعہ لوٹ پڑا تو پھر کئی صدیوں کے حاصل شدہ علم و تمدن کی خیر نہیں ـــ دراصل بڑی قومیں ہمیں خاندانی منصوبہ بندی کا سبق پڑھا کر اپنی خیر منا رہی ہیں اور بعض ہم چیونٹوں کو پیدا ہونے سے قبل ہی مسلوا دینا چاہتی ہیں۔ لوگ بھی خوش ہوتے ہیں کہ ایک بچے کا بوجھ اٹھانے سے بہتر ہے کہ ایک ٹیلی وژن خرید لیا جائے۔ پھر ایک مطلب یہ ہے کہ مسلمان اللہ لوگ ہیں یہ دور دراز تک دیکھ سوچ نہیں سکتے۔ ان کو خود ان کے ہاتھوں اپنے آزاد ملکوں میں آہستہ آہستہ پہلے کمزور اکثریت میں اور پھر بے حیثیت اقلیت میں بدلوا دو۔ اس دوران میں ان کی نوجوان نسلوں کے اخلاق بھی تباہ ہوں گے۔ گھر گھر میں بچے اور بچوں کی پیدائش اور جنسی رابطے کی حقیقت کے وعظ پہنچیں گے، بہت سے ہنستے بستے گھر ان "گولیوں" اور دوسرے متعلقہ وسائل کی وجہ سے اجڑیں گے جن کے ساتھ خواتین کی صحت کے لیے دسیوں خرابیوں کے سامان ہیں۔ پھر ایک فائدہ یہ بھی کہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ خدا کے کاموں میں انسان مداخلت کر کے کچھ سے کچھ نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اور خدا کسی مداخلت کو نہیں روک سکتا۔ (نعوذ باللہ) اصل چیز سائنس ہے، خدا تو بس خدا ہے۔

ان حقائق کے ہوتے ہوئے جب بڑی قوتیں قرضے اور ایڈ اور اسلحہ دینے پہ معاہدات

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

ایسی مین پاور کے سامنے اونچے تختوں پر بیٹھی عالمی قوتیں ان سوکھے ڈھانچوں اور "چیونٹوں" کے سیلاب سے ڈر رہی ہیں جو آگے بڑھیں تو پھر صفیں کی صفیں مرتی جاتی ہیں۔ مگر مرنے والوں کی رو نہیں تھمتی۔ حتیٰ کہ کچھ تو وسائل ختم ہو جاتے ہیں اور کچھ ظلم کرنے والوں کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں ایسے حالات سے بچنے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی ہی بہتر ہے۔

کرتے ہوئے یہ منواتی ہیں کہ تم لوگ اپنے ہاں خاندانی منصوبہ بندی کی مہم چلا کر کامیاب نتائج دکھاؤ گے اور اس کارِ خیر کے لیے ہم جذبۂ خدمت کے تحت بھاری رقوم اپنے پلے سے دیں گے تو ہمارے حکمران زبان سے ، یا کم سے کم آنکھوں سے اور دستخط کرتے ہوئے قلم کی جنبشوں سے کہہ دیتے ہیں : "یس سر!"

بس ہماری حیثیت ساری کی ساری سمٹ کر اس ایک "یس سر" میں آجاتی ہے - یہی جادو کا اسمِ اعظم ہے جیسے ایک سیکشن آفیسر اپنے سیکرٹری کے سامنے کہتا ہے - یہی کسی پارٹی کا عہدہ دار اپنے لیڈر کے سامنے کہتا ہے ، یہی کوئی وزیر اپنے وزیر اعظم سے کہتا ہے - یہی ایک فوجی افسر اپنے کمانڈر سے کہتا ہے - اور یہی ہمارے اکابر جن سپر پاورز کی زلفوں کے اسیر ہوتے ہیں ، اُن سے کہتے ہیں -

تو جناب ساری قوم فقط ایک "یس سر" ہے - یہ "یس سر" نہ ہو تو پھر کچھ نہ رہے -

---

مُسلم اکثریتی ممالک کو جس طرح لادین عالمی طاقتوں نے دبوچا ہوا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے بظاہر آزاد ملکوں کی حکومتیں اور اکابر اور دانش ور کوئی ایسا لفظ زبان پر نہیں لا سکتے ، کوئی قانونی فیصلہ نہیں کر سکتے ، کوئی سفارتی اقدام نہیں کر سکتے ، اپنے دفاعی معاملات اور خارجہ تعلقات کو سو فی صدا اپنی آزاد مرضی سے طے نہیں کر سکتے ، حتیٰ کہ محض معاشی ترقی اور قدرتی وسائل کے متعلق بڑے بڑے منصوبوں یا وسیع الاثر مالیاتی مسائل اور خام اجناس کی فراہمی اور باہر سے مشینی اور کیمیاوی اور دفاعی سامان کی خریداری تک کے معاملات میں قطعی فیصلے نہیں دے سکتے - اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں مُسلم اقلیتوں کا حال کیا ہوگا ؟

یونانی ترکی اقلیت پر ، فلپائنی مورو تحریک آزادی اُٹھانے والے مسلمانوں پر ، حکامِ حبشہ اریٹیریا کی سلب شدہ آزادی کو بحال کرنے کی جدوجہد کرنے والے مسلمانوں پر برسوں سے ستم توڑ رہے ہیں - یہودی حکومت نے عرب اقلیت پر اوّل روز سے پوری بے شرمی کے

سانختہ طرح طرح کے مظالم ڈھائے ہیں، ان کی نسل کشی کی کوششیں کی گئی ہیں۔ بہت سے لوگوں کو وطن سے محروم دیا ہے۔ معاشی ذرائع کے لحاظ سے مسلمانوں کو مصیبت میں ڈال دیا ہے اب فلسطین کی مسلم اقلیت کے تازہ ترین مطالبۂ آزادی پر جو زن بچہ سامنے آتا ہے اُسے بہیمیت کے کولہو میں پیلا جا رہا ہے۔ بھارت کے مسلمان پس رہے ہیں، بنگلہ دیش کے مسلمانوں پر بھارتی سامراج کی منحوس پرچھائیں پڑ رہی ہے۔ برما اور تھائی لینڈ کے مسلمانوں پر اسن آف دی سوائل کا کوڑا برس رہا ہے۔ یوگوسلافیہ اور البانیہ کے مسلمانوں کو وحشت اپنے سینگوں پر اچھال رہی ہے۔ پھر روس میں مسلم اقلیتیں خدا اور رسول کا نام لینے کو پورے دورِ انقلاب میں ترس گئی ہیں۔ سری لنکا میں انہیں کبھی بودھوں نے تنگ کیا اور کبھی سہنالیوں نے اذیتیں دیں۔ اور اب بھارتی لشکری بھی ان پر دستِ تعدی دراز کر رہے ہیں۔ دنیا میں بین الاقوامی انصاف کے علمبردار، انسانی حقوق کے پاسبان ٹک ٹک یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور نہ کوئی جنبشِ لب ہے، نہ حرکتِ قدم۔ اونچے اونچے دعوے اور نعرے جھوٹے اور منافقت کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ اندر سے یہ عدل کے داعی اور پرستار اور انسانیت کے سرپرست مسلمانوں کی مصیبتوں پر خوش ہیں۔ اِدھر انڈونیشیا میں پنج بنائے اسلام کی بیخ کنی کے لیے پنچ شیلا کا جبری نفاذ۔ دوسروں کا تو کیا کہنا، خود مسلمان دنیا بھر میں مگن پڑے ہیں، کسی میں یارا نہیں کہ اپنے برادرانِ ملت کے دکھوں پر کوئی آہ وفغاں ہی کر دے۔ ہمارے حکمران کوئی بیان نہیں دے سکتے۔ جمہوری پارلیمنٹیں کوئی قرارداد پاس نہیں کر سکتی۔ محض مسجدوں سے اضطراب انگیز ماتمی آوازیں اُٹھتی ہیں۔ مگر ان کو "ملا" کی آواز کہہ کر خود اپنے ہی لوگ کچل دیتے ہیں۔

خود دیارِ مغرب میں جو مسلم اقلیتیں جا کر مختلف ملکوں میں بس گئی ہیں وہ بھی آرام چین سے نہیں ہیں۔ برطانیہ میں تو اُن کو نسلیت اپنے خونیں ناچ سے وقتاً فوقتاً پریشان کرتی رہتی ہے لیکن برطانیہ سمیت ناروے سویڈن سے لے کر امریکہ کینیڈا تک اکثر ممالک میں ان کو اپنی طرزِ تہذیب پر قائم رہنے میں مشکلات درپیش ہیں۔ خصوصاً وہاں کے تعلیمی نظاموں میں ان کے عقاید وتصورات کے پرزے اڑتے ہیں۔ مغربی معاشرے چاروں طرف شراب وشباب کے طوفان اٹھائے ہوئے ہیں۔ جہاں جانے والے خاندانوں کے بچے بھی آہستہ آہستہ

اثر پذیر ہوتے ہیں - اور بطورِ خاص جو نوعمر متعلمین تعلیم یا کسی فنی تربیت کے لیے وہاں جاتے ہیں یا کوئی ملازمت کرتے ہیں - ان میں سے بہت ہی خوش قسمت افراد سیلِ زمانہ میں بہنے سے بچ سکتے ہیں - پھر اُردو زبان کو تعلیم گاہوں اور ذرائع ابلاغ میں جگہ نہ ملنے (یا برائے نام حصہ ملنے) کی وجہ سے نئی نسلوں کا دینی علوم اور قومی لٹریچر سے رابطہ ٹوٹ جاتا ہے- قومی زبان کی یہ چھوٹی سی "جان بچاؤ" کشتی جو باہر جاکر حسین غلاظت کے سیلاب میں ذریعۂ تحفظ ہوسکتی ہے، یہ بھی مسافر سے چھن جاتی ہے اور وہ ڈبکیاں کھاتا ہے، مگر جس قوم نے خود اپنے ہی گھر میں قومی زبان کو اچھوت بنا دیا ہو، وہ اُسے باہر کیا وقعت دلوا سکتی ہے -

مسلمان اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں ـــــ وہ دنیا میں ایک ارب کی تعداد میں ہوتے ہوئے انتہائی مصیبت اور پستی اور بے بسی میں مبتلا ہیں -

---

اِس موقع پر مسلمانوں سے دشمنی رکھنے والی صہیونی تحریک کا ذکر ضروری ہے - اس تحریک کے زیرِ اثر یہودی جہاں بھی ہیں، مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روکنے اور پیچھے دھکیلنے میں بہت بڑا پارٹ ادا کر رہے ہیں - یہودیوں کے پاس بڑے بڑے علمی و تحقیقی و سائنسی کاموں کے ماہرین کے علاوہ چند مادی قوتوں کا ارتکاز ہے- سرمایہ اور دنیا کے فنانشل اداروں، بنک کاری اور مارکیٹوں میں نفوذ، تیل اور دوسرے بڑے بڑے کاروباروں میں ان کا دخل، اور دیگر منشیات کی خرید و فروخت پر قابو، فلموں اور نائٹ کلبوں اور ہر قسم کے شو بزنس میں خاصا حصہ، اپنے کاروباروں کے اشتہارات اور اپنی اشتہاری فرموں کے ذریعے اخبارات و جرائد پر تسلط، عالمی پروپیگنڈا اور خبر سازی اور خبر رسانی کے وسائل سے بھرپور کام لینے کا وسیع تجربہ، اقوام اور اس سے متعلق عالمی اداروں میں شرکت، امریکی صدارت کے انتخاب میں بالادستی اور قصرِ اسپید میں نفوذ اور جمہوری ایوانوں اور بعض اہم کمپنیوں میں اہم حیثیت ان ساری قوتوں کو وہ مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں - حال ہی میں بڑے سرمایے سے

چلنے والا ایک اعلیٰ درجے کا انگریزی رسالہ "عریبیا" (لندن) جو شاندار معیار سے شائع ہو رہا تھا، محض اس لیے بند ہو گیا کہ یہودی نہ تو اسے کافی اشتہارات حاصل کرنے دیتے تھے اور نہ اس کی فروخت کو بڑھنے دیتے تھے۔ امریکہ میں پاکستان کے ایڈ اور قرضوں اور اسلحہ کے معاملات کے بگڑنے میں ہمیشہ یہودی ہاتھ متحرک رہا ہے۔

صیہونی قوتِ بد راہ (EVIL FORCE) کے ساتھ متوازی طور پر بھارت بھی آگے بڑھ رہا ہے اور دونوں کا قارورہ کئی سال پہلے سے مل چکا ہے۔

یہودیوں کی سرپرستی امریکہ اور بھارت کی ۵۰ فیصد سرپرستی روس اور ۲۵ فی صد امریکہ کرتا ہے۔

ان قوتوں کو پہچانیے جو ہمیں نہ صرف مادی لحاظ سے مات دینے کے لیے کوشاں ہیں بلکہ سپر پاورز کے عین مطابقِ منشا ہمیں لادینیت اور اوپن سوسائٹی کے تصور کی طرف بڑے زور سے دھکیل رہی ہیں۔

اور ہم ان کی مرضی کے مطابق اس طرح چل رہے ہیں جیسے ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہو اور دشمن ہمارا ہاتھ پکڑ کے کسی گڑھے میں دھکیلنے کے لیے ہمیں لے جا رہا ہو۔

وا مصیبتاہ !

یہ سلسلۂ اشارات تو چلتا رہے گا۔ یہاں مجھے اس تازہ ترین صورتِ احوال کا خیال آیا جس سے مجاہدین افغانستان اور مہاجرین اور ان کے ساتھ ہم دوچار ہیں۔ دنیا کی دو سپر پاورز (امریکہ و روس) نے آپس ہی آپس گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ اب روس، روس کی کٹھ پتلی کابل حکومت، امریکہ، بعض مسلم ملک، چین اور بھارت نیز پاکستان کی روسی اور بھارتی لابی، سب کا دباؤ اس مسئلہ پر ہم پر زیادہ سے زیادہ پڑ رہا ہے۔ عالمی پروپیگنڈا مشینری کی گراریاں تیزی سے گھوم رہی ہیں۔ اخباری اسکرین پر ہر روز نئی نئی اور متضاد سرخیاں اور بیانات سامنے آتے ہیں۔ نتیجہ جو کچھ سپر پاورز اور ان کے حواریوں کو مطلوب ہے، راقم کی رائے

کے مطابق اس کا ایک جز تو قطعی ہے اور وہ یہ کہ افغانستان میں اسلامی حکومت قائم نہ ہونے پائے۔ (خدا کرے کہ دشمنوں کی یہ تمنا بر نہ آئے) کیونکہ یہ غیر مسلم دنیا کے لیے بدترین اور ناخوشگوار ترین واقعہ ہوگا۔ ایران میں شیعہ اسٹیٹ کے ساتھ افغانستان کی سنی اسٹیٹ بھی قائم ہو جائے تو دنیا کا نقشہ احوال سخت متاثر ہوگا۔ "بنیاد پرستی" کا ظہور و غلبہ ان کے لیے ایسا ہی ہے جیسے جنونی چھاپہ مار اور پاگل کمانڈوز تہذیبِ بے خدا کے پورے جہاز کو مع مسافروں کے اغوا کر کے لے جائیں اور جہنم میں ڈال آئیں۔

روس، امریکہ، بھارت، چین، اسرائیل تو ہیں ہی بنیاد پرستوں کی اسلامی حکومت کے خلاف، خود پاکستان کے دانشوروں اور اہل قوت میں ایسے با اثر لوگ موجود ہیں جو اس خطرے سے پاکستان کو بچانا چاہتے ہیں کہ اس کے عین دروازے کے سامنے ایک اسلامی حکومت قائم ہو، جس کے نتیجے میں پاکستان کے اندر لادینیت کا طلسم ٹوٹ جائے اور اسلامی حکومت اور نفاذِ شریعت کی تحریک زور پکڑے۔

اور جس زور سے پاکستان نے اس معاملے میں سپر پاورز کے سامنے سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا کی شان دکھائی ہے اور جہاں جہاں خارجہ پالیسی کو ناک رگڑنی پڑی اس نے بہت ہی حسن و خوبی سے رگڑی ہے، حتیٰ کہ بھارت کو علاقے کا چوہدری ماننے کی جرأتِ رندانہ بھی ہوگئی ان حالات نے یہی گواہی دی ہے کہ جیسے کہ پہلے میں نے کہا کہ ہم بہ حیثیت قوم اقوام عالم کے سامنے صرف "بس سر" بن کر رہ گئے ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

زوال تو ہم پر طاری ہے ہی ___ اور ہم ایک الگ ریاست بنا کر بھی غلاظت کی دلدل سے نہ نکل سکے جسے غلامی نے ہمارے لیے تیار کیا تھا ___ ستم یہ ہے کہ ہمارے ہاں نسبتہً دو ایک اچھے وزرائے خارجہ گذرے ہیں، لیکن اب جب کہ ایک برا وقت سامنے ہے، ہمیں ایسا شاندار وزیر خارجہ ملا ہے کہ جس نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ تاشقند کی شکست کے بعد جس قوم نے شملہ کی شکست کھائی تھی، اسے اب تیسری بار دنیا کے سیاسی چوراہے جنیوا میں ایسی ذلیل شکست دلوائی جائے کہ اس قوم کا کوئی شہری آئندہ اس قابل نہ ہو سکے کہ وہ اپنے ملک میں بھی کوئی حق طلب کرنے کی جرأت کرے، کوئی سیاسی دعویٰ کر سکے یا اسلام

اسلام کا نام لے سکے، بلکہ ایسی شام غریباں طاری ہو کہ بس ماہرین مرثیہ خوانی کے سوا اس میں کوئی اور صلاحیت اُبھرے ہی نہیں!

بہ سبب یہ حیثیت ایک غلط رَو مسلم قوم کے ہماری اپنی شامت اعمال! اب جو رہی سہی کسر ہے اُسے پورا کرنے کے لیے ملک کی چند مخالف پاکستان شخصیتوں کو چھانٹ کر آگے لائیے اور انہیں صدارت و وزارت سونپ کر کہیے کہ یہ ہے جناب پاکستان، اسے خراب خستہ حال کرنے کے لیے اپنے اپنے فلسفوں کے مطابق جو کچھ آپ کر سکتے ہیں، شوق پورا کریں۔ پہلے ہم اپنا شوق پورا کر چکے ہیں، اب آپ کا حق ہے۔

ہو سکتا ہے کہ صورتِ حالات کے کچھ اور بدتر ہونے کے بعد یہاں کی چلتی پھرتی کروڑوں لاشوں میں ایمانی اور سیاسی زندگی پیدا ہو جائے۔

کتنا اچھا موقع پیدا ہوا کہ پاکستان کی فلاح پسند بھاری اکثریت اور افغان مجاہدین اور مہاجرین کی قابلِ فخر قوت اور محض حالات کے تقاضوں اور امریکی مفاد کے زیر اثر خود امریکی قوت بین الاقوامی فورم میں ہمارے سامنے ہے، مگر ہم اس بہترین موقع سے فائدہ اُٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔

یہ سطریں لکھتے ہوئے مجھے خدا سے اُمید ہے کہ وہ مزید چند روز میں حالات کا نقشہ تبدیل کر کے بہتری کی راہیں پیدا کر سکتا ہے اور ہماری فرو مائیگیوں کے باوجود کچھ اچھے نتائج و اثرات کو ہمارے لیے مقدر کر سکتا ہے ــــــ ان مخلص مردوں اور عورتوں اور غریبوں اور امیروں کی بے حساب قربانیوں کی قدر افزائی کے طور پر جنھوں نے پاکستان کو سچے جذبات سے اس لیے چاہا تھا کہ اس میں اسلام کا بول بالا ہو سکے۔

بدقسمتی سے دونوں بڑی طاقتوں کی مخفی دلی تمنا یہ ہے کہ اس علاقے میں خون خرابہ جاری رہے، ہو سکے تو اس کے دو حصے ہو جائیں، شمالی حصے سے روس قیمتی معدنیات کے خزانے حاصل کرتا رہے اور اسلام کی حکومت بھی قائم نہ ہو، کیونکہ فنڈامنٹلزم کے قائلین کی اسلامی حکومت سب کے لیے ایٹم بم سے زیادہ خطرناک ہے۔ (باقی)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

روزہ داروں کے لیے دو اہم احادیث

(ادارہ)

(۱)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ ...... اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ لَیْلَةَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّ اِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ - (مُتَّفَقٌ عَلَیْهِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور احتساب کے ساتھ، تو اس کے وہ سب گناہ معاف کر دیئے جائیں گے جو اس سے پہلے سرزد ہوئے ہوں گے۔ اور جس شخص نے رمضان میں قیام کیا (یعنی راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت کی) ایمان اور احتساب کے ساتھ، تو معاف کر دیئے جائیں گے اس کے وہ قصور جو اس نے پہلے کیے ہوں گے۔ اور جس شخص نے لیلۃ القدر میں قیام کیا، ایمان اور احتساب کے ساتھ تو معاف کر دیئے جائیں گے اس کے وہ سب گناہ جو اس نے پہلے کیے ہوں گے۔ (متفق علیہ)

اِحتِسَاب اس چیز کا نام ہے کہ آدمی اپنے تمام نیک اعمال پر صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اجر کا امیدوار ہو اور خالصتہً اسی کی رضا جوئی کے لیے کام کرے۔

اس حدیث میں گناہوں سے معافی کی جو خوشخبری سنائی گئی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے اور آخرت کی بازپرس سے بے خوف ہیں ان کو اس بات کا لائسنس دیا جا رہا ہے کہ بس رمضان کے روزے رکھ لو، تراویح پڑھ لو اور لیلۃ القدر میں کھڑے ہو کر عبادت کر لو، تو پچھلا حساب صاف اور آگے پھر گیارہ مہینے تمھیں جو کچھ کرنا ہے کرتے رہو۔ رشوتیں کھاؤ، لوگوں کے حق مارو، جو ظلم و ستم چاہو کرو، رمضان میں آکے پھر عبادت کے لیے کھڑے ہو جانا۔ روزے رکھ لینا اور نمازیں پڑھ لینا اور پھر پہلے کا کیا ہوا سب معاف ہو جائے گا۔

اس طرح کی احادیث کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا کہ ان کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ جیسا کہ پہلے وضاحت کی جا چکی ہے کہ ان کے مخاطب وہ صلحا و ابرار ہیں جو اپنی زندگیاں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے مطابق بسر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن سے اگر کوئی لغزش یا گناہ سرزد ہو جاتا تھا تو ان کی نوعیت ایسی ہرگز نہیں ہوتی تھی کہ جیسے ایک آدمی پوری ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ گناہ کا ارتکاب کرے۔ اور پھر اس پر ڈٹا رہے۔ بلکہ وہاں صورت اس سے یکسر مختلف تھی۔ ان راستباز لوگوں سے اگر کوئی قصور سرزد ہو بھی جاتا تھا تو وہ بشری کمزوری کی وجہ سے ہوتا تھا اور وہ ہر وقت اس پر توبہ کے لیے مستعد رہتے تھے۔ بشری کمزوری سے اگر کسی سے کوئی قصور سرزد ہو جائے اور وہ اس کے بعد نیکی اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کو اپنا شعار بنائے رکھے تو وہ بجائے خود ایک توبہ ہے — توبہ کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ایک آدمی سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور اس نے اس سے توبہ کر لی تو یہ بات بھی گناہ کی معافی کا ایک ذریعہ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک آدمی سے قصور سرزد ہوا اور پھر وہ دوسرے کاموں میں ایسا مشغول ہوا کہ توبہ کرنا بھول گیا۔ تو اس کے بعد اس نے جو نماز پڑھی وہ نماز اس کے لیے پہلے کی لغزش کو اس کے حساب سے صاف کر دے گی۔ اسی طرح اگر اس نے روزہ رکھا

تو وہ بھی اس کے گناہ کو صاف کر دے گا ___ دراصل توبہ اسی چیز کا نام ہے کہ ایک شخص ایک وقت میں ایک قصور کا مرتکب ہوا تھا، لیکن اس کے بعد وہ پھر اپنے رب کی طرف پلٹ آیا۔ جیسے ایک نوکر اگر اپنی کسی غلطی کی وجہ سے اپنے مالک کی اطاعت سے نکل جائے لیکن پھر معافی مانگ لے اور خدمت پہ حاضر ہو جائے تو اس سے ایک دفعہ قصور سرزد ہو جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مالک اُسے ہمیشہ کے لیے اپنی نوکری سے نکال دے گا، بلکہ جس وقت وہ آکر معافی مانگتا ہے اور پہلے کی طرح خدمت کرنے لگتا ہے تو مالک اس سے درگذر کرے گا اور اس کی گذشتہ وفاداری کی وجہ سے اس پر پہلے کی طرح مہربان ہو جائے گا۔

ایسا ہی معاملہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ ہے۔ بندہ اگر بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کا وفادار ہے اور جان بوجھ کر اس کے مقابلے میں استکبار اور سرکشی کرنے والا نہیں ہے، تو اگر اس سے کسی وقت کوئی قصور سرزد ہو جاتا ہے اور اس قصور کے بعد وہ پھر خدا کے دربار میں نماز کے لیے حاضر ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کو اپنی مغفرت سے محروم نہیں رکھے گا۔ کیونکہ اس کا طرزِ عمل یہ بتاتا ہے کہ وہ ٹھوکر تو کھا گیا تھا، لیکن اپنے رب سے بھاگا نہیں تھا، اس کا باغی نہیں ہو گیا تھا ___ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ اگر ایک شخص نے ایمان اور احتساب کے ساتھ روزے رکھے تو اس کے پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ رمضان میں راتوں کو کھڑے ہو کر عبادت کی تو وہ بھی پچھلے قصوروں کی معافی کا ذریعہ بن گئی۔ اسی طرح اگر وہ لیلۃ القدر میں عبادت کے لیے کھڑا ہوا تو اُس کا یہ عمل بھی اس کے پچھلے قصوروں کی معافی کا سبب بن گیا۔

(۲)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ یُضَاعَفُ الْحَسَنَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا اِلٰی سَبْعِ مِائَۃِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّہٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ، یَدَعُ شَھْوَتَہٗ وَطَعَامَہٗ مِنْ اَجْلِیْ لِلصَّائِمِ

فَرْحَتَانِ فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهٖ وَلَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْيَبُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ رِيْحِ الْمِسْكِ وَالصِّيَامُ جُنَّةٌ وَاِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفُثْ وَلَا يَصْخَبْ فَاِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ اِنِّیْ امْرُءٌ صَائِمٌ (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے کئی گنا بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک نیکی دس گنی تک اور دس گنی سے سات سو گنی تک بڑھائی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزے کا معاملہ اس سے جدا ہے، کیونکہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا ـــــ روزہ دار اپنی شہواتِ نفس اور اپنے کھانے پینے کو میرے لیے چھوڑتا ہے ـــــ روزہ دار کے لیے دو فرحتیں ہیں۔ ایک فرحت افطار کے وقت کی اور دوسری فرحت اپنے رب سے ملاقات کے وقت کی ـــــ اور روزہ دار کے منہ کی بساند اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے ـــــ اور روزے ڈھال ہیں، پس جب کوئی شخص تم میں سے روزے سے ہو تو اُسے چاہیے کہ نہ اُس میں بدکلامی کرے اور نہ دنگا فساد کرے ـــــ اگر کوئی شخص اس سے گالی گلوچ کرے یا لڑے تو وہ اس سے کہہ دے کہ بھائی میں روزے سے ہوں (متفق علیہ)

یہ جو فرمایا کہ دوسری نیکیاں تو دس گنی سے لے کر سات سو گنی تک بڑھائی جاتی ہیں لیکن روزے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ میرے لیے ہے اور میں اُس کی جزا دوں گا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسری نیکیاں اللہ کے لیے نہیں ہیں اور اللہ ان کی جزا نہیں دے گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق روزہ اس کے لیے خاص ہے اور وہ اس کی جتنی چاہے گا، جزا دے گا۔ جب یہ فرمایا کہ دوسری نیکیاں سات سو گنی تک بڑھائی جاتی ہیں اور اس کے مقابلے میں استثنیٰ کے ساتھ روزے کے متعلق فرمایا کہ میں ہی

اس کی جزا دوں گا۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ روزے کے اجر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ جس قدر چاہے گا روزہ دار کو اُن کا اجر دے گا۔

روزے کی یہ غیر معمولی فضیلت کیوں؟

بات دراصل یہ ہے کہ دوسری تمام نیکیاں آدمی کسی نہ کسی ظاہری فعل سے انجام دیتا ہے۔ مثلاً نماز ایک ظاہری فعل ہے۔ نماز پڑھنے والا نماز میں اُٹھتا اور بیٹھتا ہے، رکوع اور سجدہ کرتا ہے۔ اِس طرح یہ ایک نظر آنے والی عبادت ہے ـــــ اسی طرح حج اور زکوٰۃ کا معاملہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس روزہ کسی ظاہری فعل سے ادا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک ایسا مخفی فعل ہے جو فقط آدمی اور اس کے خدا کے درمیان ہوتا ہے ـــــ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ روزہ دراصل اللہ کے حکم کی تعمیل کی ایک منفی شکل ہے۔ مثلاً نہ کھانا نہ پینا اور اسی طرح جن دوسری چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے باز رہنا۔ اس منفی فعل کو یا تو آدمی خود جان سکتا ہے یا اس کا رب، کسی تیسرے کو معلوم نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ منفی فعل اس نے کیا ہے یا نہیں۔ مثلاً اگر ایک آدمی چھپ کر کھا پی لے تو کسی کو اس کا علم نہیں ہو سکتا ـــــ چنانچہ وہ روزہ نہ رکھتے ہوئے بھی کہہ سکتا ہے کہ میں روزے سے ہوں اور کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ نہیں جان سکتا کہ آیا وہ روزے سے ہے یا نہیں۔ اگر وہ روزے سے ہے تو اس بات کو صرف وہ جانتا ہے اور اگر روزے سے نہیں ہے تو اس کو بھی اس کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ اسی وجہ سے روزے کا معاملہ صرف خدا اور اس کے بندے کے درمیان ہوتا ہے اور اسی بنا پر اس میں ریا کا امکان نہیں ہوتا ـــــ ایک آدمی دُنیا کو دکھانے کے لیے بیشک یہ کہتا پھرے کہ میں روزے سے ہوں لیکن حقیقتِ صوم کے اندر اس ریاکاری کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ وہ خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اسی لیے فرمایا کہ روزہ خاص میرے ہی لیے ہے، وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ۔ میں ہی ان کی جزا دوں گا۔

مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ روزے کی بے حد و حساب جزا دے گا۔ جتنے گہرے

اور اخلاص کے ساتھ آپ روزہ رکھیں گے، اللہ تعالیٰ کا جتنا تقویٰ اختیار کریں گے، روزے سے جتنے کچھ روحانی و دینی فوائد حاصل کریں گے اور پھر بعد کے دنوں میں بھی ان فوائد کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جزا بڑھتی چلی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک روزے کی اس غیر معمولی فضیلت اور مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ روزہ دار اپنی شہواتِ نفس اور کھانے پینے کو صرف اللہ ہی کی خاطر چھوڑتا ہے، اس لیے وہ بھی اسے آخرت میں بے حد و حساب اجر سے نوازے گا۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں ان کا خاص احترام ملحوظ رکھا جائے۔

(ادارہ)

قرآن میں اصحابِ فیل کا واقعہ

جناب محمد رفیق چودھری صاحب - ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور

(۲)

بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ کے معنی متجددین حضرات نے اس سورہ کے الفاظ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ پر تدبر نہیں کیا اور نہ ہی ان الفاظ کو قرآن مجید کے دوسرے نظائر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اگر صرف انہی دو الفاظ پر تھوڑا سا غور و تدبر فرما لیتے تو ان کے ذہن میں کبھی وہ نرالی تاویل پیدا نہ ہوتی جسے وہ بیان کیا کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ کے الفاظ اسی صورت میں صرف دو بار آئے ہیں۔ اور دونوں مرتبہ ان سے مراد "عذابِ الٰہی کے پتھر" ہیں، نہ کہ انسانوں (یا قریش) کے پھینکے ہوئے پتھر۔

پہلی مرتبہ یہ الفاظ سورہ ہود کی آیت ۸۲ میں اس طرح وارد ہوئے ہیں:

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ مَّنْضُودٍ	پھر جب ہمارا حکم آن پہنچا تو ہم نے اس (بستی) کے بلند کو اس کا پست بنا دیا اور ہم نے وہاں کنکر برسا دیئے۔

یہ قومِ لوطؑ پر عذابِ الٰہی کی کیفیت کا بیان ہے۔ اور اس میں حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ

کے الفاظ صریحاً اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے عذاب کے پتھروں پر دال ہیں۔ انسانوں کے پھینکے ہوئے پتھر یہاں کسی صورت مراد نہیں لیے جا سکتے۔ آیت مذکورہ میں جن پتھروں کا ذکر ہے۔ اُن سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ آسمانی پتھر ہیں جو قوم لوطؑ پر ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے برسائے گئے تھے۔

دوسری مرتبہ یہی الفاظ سورۃ الحجر کی آیت ۷۴ میں آئے ہیں:

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ	پھر ہم نے اُس بستی کو زیر و زبر
اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً	کر دیا اور ان لوگوں پر کھنگر کے پتھر
مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝	برسا دیئے۔

اس جگہ پر بھی حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ کے الفاظ انسانوں کے پھینکے ہوئے پتھروں کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی صورت میں برسائے گئے پتھروں کے لیے استعمال ہوئے ہیں کہ جن کے ذریعے قوم لوطؑ کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔

بالکل یہی الفاظ جب سورۂ فیل میں آئے ہیں تو ہم کیوں نہ اُن سے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابرہہ کے لشکر پر عذاب کی صورت میں برسائے گئے پتھر ہی مُراد نہ لیں؟ کیوں ان الفاظ کی دُور از کار تاویلیں کرنے لگیں اور اللہ کی کتاب کو سمجھنے کے لیے خود ہی اپنی آنکھوں پر پٹیاں باندھ لیں اور اپنے دلوں پر قفل چڑھا لیں؟

حَاصِبٌ یعنی سخت آندھی تجدد پسند حضرات سورۂ فیل کی تفسیر میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اصحابِ فیل کا لشکر تباہ کرنے میں دو عناصر کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک قریش کی طرف سے کنکریاں پھینکنا اور دوسرے اچانک سخت آندھی (حاصب) کا چل پڑنا۔ ان کی یہ تاویل بھی کئی لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔

اوّل یہ کہ سورۂ فیل میں حاصب یعنی سخت آندھی کے چلنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ صرف پرندوں کے جھنڈ بھیجے جانے کا ذکر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کون سی تاویل اختیار کی جائے۔ وہ جسے قرآن بیان کرتا ہے یا وہ جسے قرآن بیان نہیں کرتا۔ قرآن کی تفسیر میں اُس کے اپنے مذکورہ الفاظ معاون ثابت ہو سکتے ہیں یا پھر وہ چیزیں جن کو کسی انسان کا

تخیل خود تراش لینا ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اصحاب فیل کے واقعے میں حاصب (سخت آندھی) کے چلنے کا عنصر شامل کرنا ایک من گھڑت افسانے سے زیادہ نہیں ہے۔

ب- دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اگر یہ ممکن ہے کہ وہ بے جان ہوا میں اتنی قوت پیدا کر دے کہ اس کے ذریعے لشکر تباہ ہو جائیں تو کیا اللہ تعالیٰ سے یہ ناممکن ہے کہ وہ جاندار پرندوں کے پھینکے ہوئے سنگریزوں کے ذریعے کسی لشکر کو برباد نہ کر سکے۔ افسوس! اِن متجددین کی عقل پر جو ایک جگہ اللہ تعالیٰ کی قدرت تسلیم کر لیتے ہیں، مگر دوسری جگہ اس کی عاجزی ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ افسوس! معجزات کو نہ ماننے کی ضد بھی انسان کی عقل کو کہاں لے جاتی ہے۔

نُصرتِ الٰہی کا قانون

متجددین حضرات کا کہنا ہے کہ اصحاب فیل کے واقعے کو بھی اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی روشنی میں سمجھنا چاہیے کہ افراد کی جدوجہد ہوگی تو اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کرے گا۔ بندے اگر کوئی کوشش نہیں کریں گے تو اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید نہیں ہوگی۔

مگر متجددین یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنّتِ نصرت و تائید بندوں کی جدوجہد کے ساتھ ہر حال میں مشروط نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں اور تاریخِ اسلام بھی اس پر شاہد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے عاجز بندے کسی بوجھ اور ذمہ داری کو اُٹھانے کی قدرت و استطاعت نہیں رکھتے تو وہ اپنا خاص فضل و کرم فرما کر اپنے بندوں پر کوئی ناقابلِ برداشت بوجھ نہیں ڈالتا۔ اس ضمن میں قرآن مجید کا یہ اصل الاصول ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (البقرہ: ۲۰۶)

اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا، مگر اس کی بساط کے مطابق۔

گویا تکلیف مالایطاق کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی سنّت یہی ہے کہ وہ بندوں کی سعی و کوشش کے بغیر ہی ان پر اپنا فیضانِ رحمت کرتا اور ان کو تائید و نصرت سے نوازتا ہے۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ کے الاؤ میں ڈالا گیا تھا۔ اُس وقت آپ

نے وہ کون سی تدابیر اور جد و جہد کی تھی جس کے ذریعے وہ آتشِ نمرود سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکتے تھے؟ اور خلیل اللہ کی وہ کونسی کوشش تھی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اُس آتش کدے کو گلزار بنا دیا تھا؟

جب سیدنا یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے تھے تو اُن کی وہ کون سی عملی جد و جہد اور تدبیر تھی جس کے نتیجے میں اُن کو وہاں سے نجات بخشی گئی تھی؟ اور اللہ تعالیٰ کی سنتِ تائید و نصرت حاصل ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اس کے لیے دُعا کی اور تسبیح پڑھی تھی۔ تو یہ کوئی ایسی عملی جد و جہد اور کسب نہیں ہے جسے متجددین حضرات نصرتِ الٰہی کے قانون سے متعلق قرار دیں۔ تاہم اگر صرف دُعا و تسبیح یونس علیہ السلام کے لیے مچھلی کے پیٹ سے رہائی کا سبب بنی تھی تو یہی محرک اصحابِ فیل کے واقعہ میں بھی موجود ہے۔ صحیح واقعات کے مطابق عبد المطلب اور بعض دوسرے سردارانِ قریش نے بھی خانہ کعبہ کی چوکھٹ پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تھی کہ وہ اُن کو ابرہہ کے لشکر کے خطرے سے بچائے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی یہ دُعا قبول کی اور قریش کو اس آفت سے نجات دلائی۔

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینے جانے کا عزم کر رہے تھے اور ان کے گھر کا محاصرہ شمشیر بدست جوانوں نے کر رکھا تھا تو اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تحفظ کے لیے کون سی عملی جد و جہد اور تدبیر کی تھی جس کے نتیجے میں آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید حاصل ہوئی تھی۔ اور آپؐ دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر گھر سے بحفاظت نکل گئے تھے؟ اللہ تعالیٰ کی سنتِ تائید و نصرت اس واقعے میں بھی انسانی جد و جہد کے ساتھ ہرگز مشروط نہ تھی۔

اور یہ تو انفرادی واقعات کی مثالیں تھیں، اجتماعی صورت میں اللہ تعالیٰ کی نصرت کا قانون صرف وہی نہیں جو متجددین نے سمجھ رکھا ہے۔

جب موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل مصر سے نکل کر فلسطین جا رہے تھے اور اُن کے سامنے بحیرۂ قلزم کی خوفناک لہریں تھیں اور پیچھے کی جانب فرعون اور اس کا لشکرِ جرار ان کے تعاقب میں قریب آن پہنچا تھا تو اُس وقت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل

نے وہ کون سی عملی تدبیر اور جد و جہد کی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے سمندر کے اندر خشک راستے بنا دیے تھے؟ اور دیکھتے ہی دیکھتے فرعون اور اُس کا سارا لشکر غرقاب ہوگیا تھا۔ کیا اس وقت اللہ تعالیٰ کی یہ سنت کارفرما تھی کہ اس کے کمزور اور ناتواں بندے ایک طرف سمندر کی موجوں اور دوسری طرف فرعون کی فوجوں کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں رکھتے اس لیے اُن کو اس سخت آزمائش کی ہولناکی اور خطرے سے بچا لیا جائے؟

متجددین حضرات اس واقعے کی جھٹ سے یہ تاویل کر دیتے ہیں کہ بحیرۂ قلزم کے مدوجزر کی دو مختلف حالتوں کے پیش نظر موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل تو بسلامت پار اُتر گئے۔ لیکن اندھا فرعون اور اس کے اندھے لشکر کو اس صورتِ حال کا علم نہیں ہو سکا تھا اس لیے وہ مدوجزر کی زد میں آکر غرقاب ہو گئے تھے۔ مگر یہ تاویل قرآن مجید کے صریح الفاظ اور نصوص کے اس قدر خلاف اور عقلی اعتبار سے اس قدر بھونڈی ہے کہ اس کی تردید کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اجماعِ اُمت کے خلاف

متجددین نے سورۂ فیل کی جو نئی اور من مانی تاویل کی ہے وہ چودہ سو برس سے اس اُمت کے مفسرین کرام کی اس متفقہ اور مجمع علیہ تفسیر کے خلاف ہے جو وہ اصحابِ فیل کے واقعے کے بارے میں بیان فرماتے ہیں۔ اس صورت میں کیا ہم یہ مفروضہ قائم کر لیں کہ اُمتِ مُسلمہ کی یہ جلیل القدر، وسیع العلم اور مایۂ صد افتخار شخصیات تو چودہ سو برس سے قرآن مجید کی ایک نہایت مختصر سورہ کے الفاظ کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہی ہیں۔ اور ہمارے زمانے کے جو متجددین اور منکرینِ حدیث پیدا ہوئے ہیں وہ اس اُمت کو واقعۂ اصحابِ فیل کی صحیح صحیح تفسیر بتا رہے ہیں؟ مگر ہم اس طرح کے مفروضوں پر نہیں جم سکتے۔ اُمت کے تمام علمائے اسلام کے خلاف ہم عدمِ اعتماد کی تحریک نہیں پیش کر سکتے۔ کیونکہ اس صورت میں ہم پورے دینِ اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ آج ہمارے پاس وہی قرآن مجید محفوظ اور موجود ہے جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اُمت کے سپرد کیا تھا۔ پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور آپؐ کا اسوۂ حسنہ آج ہمارے درمیان من وعن

موجود ہو سکتا ہے؟ اور جب ہمارے ہاتھ سے کتاب و سنت دونوں نکل جائیں تو پھر ہمارے ہاتھ میں باقی کیا رہ جاتا ہے؟ عقلِ سلیم یہی کہتی ہے کہ چودہ سو برس پر محیط ہزاروں اور لاکھوں اہلِ علم مفسرینِ کرام جن میں عرب و عجم کے علمائے اسلام شامل ہیں، ان لوگوں کی بہ نسبت بہت بہتر طور پر قرآن مجید کی تفسیر بیان کر سکتے ہیں جن کا سرمایۂ افتخار ہی مغرب زدگی کا احساس ہے اور جن کا ذہن مغرب سے مرعوب ہو کر اصولِ دین کو بگاڑنے میں سرگرمِ عمل ہے۔

قریش پر بے حمیتی کا الزام تجدد پسند حضرات کہتے ہیں کہ اگر سورۂ فیل کی روایتی تفسیر مان لی جائے تو اس سے ان کے ممدوح "قریش پر بے حمیتی کا الزام" عائد ہوتا ہے جو کہ اُن کے خیال میں ایک نامناسب بات ہے۔

سبحان اللہ! مشرک، بت پرست اور کمزور قریش نے اگر ابرہہ کے لشکرِ جرار اور ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کیا اور وہ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اس چیز کو اگر مفسرین کرام نے بطور واقعہ بیان کر دیا ہے تو اس سے متجددین کے نزدیک غیورؔ قریش پر بے حمیتی کا الزام لگتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی مؤرخ یا صاحب تفسیر یہ تاریخی حقائق پیش کرے کہ بت پرست قریش نے توحید کے مرکز خانہ کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت نصب کر کے خانۂ خدا کو بت خانے میں تبدیل کر دیا تھا اور یہ کہ قریش کے لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے تو کیا اس وقت ان تاریخی واقعات کے ذکر سے قریش پر بے حمیتی کا الزام نہیں لگتا۔

دراصل سورۂ فیل کا مرکزی مضمون اور موضوع اللہ تعالیٰ کو محض معاون و مددگار ثابت کرنا اور قریش کو ہیرو بنا کر پیش کرنا نہیں ہے جیسا کہ متجددین حضرات نے سمجھ رکھا ہے بلکہ اس سورہ کا موضوع اور مرکزی مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ساری نوعِ انسانی کے سامنے یہ حقیقت کھول کر بیان کر دی ہے کہ فی الواقع وہی قادرِ مطلق ہے۔ وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے جو چاہے کر سکتا ہے۔ سب کے سامنے اصحابِ فیل کا واقعہ ہوا تھا۔ اور یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی قدرتِ قاہرہ تھی جس نے خانہ کعبہ

کی حفاظت فرمائی کیوں کہ قریش کے لیے بیت اللہ کا دفاع ممکن نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی نے اپنی ایک کمزور اور حقیر مخلوق پرندوں کے ذریعے ایک بڑے طاقت ور دشمن کو نیست و نابود کیا اور قریش کو بھی ہلاک و برباد ہونے سے بچا لیا۔ شرک کے پجاری اور جھوٹے معبود سب بے بس تھے۔ اور اس موقع پر صرف اللہ کی قوّت و قدرت تھی جس نے اپنے گھر کو اور اہلِ مکہ کو ایک عظیم خطرے سے محفوظ کر دیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی قادرِ مطلق ہے، معبودِ حقیقی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور بندوں کو صرف اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن۔

اِسلام کا فلسفۂ اخلاق

جناب محمد فاروق خاں صاحب - انڈیا

اخلاق کے سلسلے میں جب ہم اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں جو کامل، مستند اور خدا کی طرف سے آیا ہوا آخری دین ہے، تو ہمیں ان سارے ہی سوالات کا کافی وشافی جواب مل جاتا ہے جو اخلاقیات کے مطالعہ میں اُبھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں — یہاں ہم کو خیر و شر، نیک و بد، صحیح اور غلط کا واضح علم ہوتا ہے۔ یہاں صاف الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ علم کا اصل ماخذ خدا کی ہدایت اور کتابِ الٰہی ہے۔ خدا نے جو قانونِ اخلاق عطا فرمایا ہے اس کے واجب الاطاعت ہونے کے لیے یہی بنیاد کافی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔ انسان کے لیے جس منتہا و مقصود کی ضرورت ہے وہ خدا کی ذات اور رضائے الٰہی کے علاوہ کوئی دوسری شے نہیں ہوسکتی۔ خدا کی ذات ہی وہ نفسِ اعلیٰ اور کامل ترین ذات ہے جو نفسِ انسانی کا ملجا و ماویٰ قرار پاتی ہے۔ اگر خدا کی ہستی کے سوا کسی اور شے کو ہم منتہائے حیات اور غایتِ ہستی قرار دیتے ہیں تو یہ حق کے خلاف اور نفسِ انسانی پر ظلم ہوگا۔ نفسِ انسانی کو جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے، دوسری تمام اشیا کے مقابلہ میں فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ اس لیے اس کا مقصود کوئی ایسی چیز ہرگز نہیں ہوسکتی جو شخصیت (PERSONALITY) کے وصف سے عاری ہو۔ اس لیے لازمی طور پر انسان کے جذبات و احساسات اور اس کی سعی و جہد کا رُخ خدا ہی کی طرف ہونا چاہیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تارے آسمان میں دیر تک چمکتے ہیں۔ چاند

ہماری تاریک راتوں کو منور کرتا ہے اور سورج سے روشنی اور تمازت حاصل ہوتی ہے، لیکن ہمارے دل کے نہاں خانے کے لیے ان کے پاس کوئی روشنی نہیں ہے اور نہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں چھپی اُمنگوں کے لیے ان کے پاس کوئی گرمی ہے۔ کائنات میں جو بھی ہے خدا کا دستِ نگر اور محتاج ہے، اس لیے اس کے سوا کوئی نہیں جو ہماری زندگی اور ہماری تگ و دَو کا اصل محور و مرکز قرار پاسکے۔

انسان کے لیے واضح فلاح اور خیر کی بات یہ ہے کہ وہ اس امتحان میں کامیاب ہو جس سے وہ دنیا میں دوچار ہے۔ جو طرزِ عمل اس بھلائی کے حصول میں مددگار ہو وہی درست ہے اور جو طرزِ عمل اس بھلائی کے حصول میں مددگار نہ ہوسکے، بلکہ اس کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو، وہ غلط ہے۔ خدا کی ہدایت ہی علم کا اصل ماخذ ہے۔ خدا کی محبت، اس کی رضا اور خوشنودی کی طلب اور اُس کی ناراضی سے بچنے کی فکر اخلاق کی پابندیوں اور بُرے اخلاق سے اجتناب کے لیے اصل محرک ہے۔ خداشناس افراد سے مل کر جو سوسائٹی اور صالح ریاست وجود میں آتی ہے جس کی تشکیل خدا کے دیے ہوئے قانون کی روشنی میں ہوتی ہے۔ اس کے اندر خود خدائی نظامِ اخلاق کے قیام کی طاقت ہوتی ہے۔ پھر قانون کی پابندی پر آمادہ کرنے کے لیے فرض شناسی کا احساس بھی پورے طور پر کام کرنے لگتا ہے اور حق سے محبت اور باطل سے نفرت کا جذبہ بھی اس سلسلہ میں محرک کا کام کرتا ہے۔

اسلام جزوی سچائیوں کی نفی ہرگز نہیں کرتا وہ سب کی سب اسلام کے اخلاقی نظام میں پیوست دکھائی دیتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ منتشر اجزا کی شکل میں یا ناقص حالتوں میں موجود ہوں اسلام انھیں محکم بُنیاد فراہم کرتا ہے۔ اسلام حصولِ کمال کی خواہش کو، جسے فکرِ انسانی کی نظر میں ایک اخلاقی محرک کی حیثیت حاصل ہے، رَد نہیں کرتا، بلکہ اسلام نے اس کی اہمیت کی تصدیق کی ہے۔ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝	اپنے خدائے برتر کے نام کی تسبیح کرو
الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝	جس نے خاکہ بنایا تو تناسب بھی قائم کیا
وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝	اور جس نے مقدر کیا تو رہنمائی بھی فرمائی

وَالَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ۙ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ؕ

اور جس نے سبزہ اُگایا تو اُسے گھنا اور سرسبز و شاداب بھی کیا۔

(۸۷: ۱—۵)

مطلب یہ ہے کہ خدا نے پیدا ہی نہیں کیا، اچھی ساخت بھی عطا فرمائی - پھر اُس نے اچھی ساخت اور حُسنِ فطرت ہی نہیں بخشا بلکہ مقصود و غایت کی طرف رہنمائی بھی فرمائی - ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زمین میں سبزہ اور گھاس اُگاتا ہے اور اس میں جو صلاحیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں - اُنھیں اُبھارنے اور ترقی دینے کا نظم بھی کرتا ہے - یہاں تک کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ننھے ننھے انکھوے بڑھ کر نہایت گھنے، شاداب اور خوشنما درخت ہو جاتے ہیں - اس قانون سے انسان کی زندگی الگ نہیں ہے - خدا نے انسان کو صرف زندگی ہی نہیں عطا کی، بلکہ وجود دے کر اس نے اسے اس کے مقصدِ وجود کا علم بھی بخشا - وہ انسان کو اس راہ کی طرف رہنمائی فرماتا ہے جس پر چل کر وہ اپنے حقیقی مقصدِ حیات کو پا سکتا ہے اور اپنی زندگی کو درجۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے - اسلام ہماری زندگی کے نازک سے نازک پہلوؤں کا محافظ ہی نہیں ہے، بلکہ وہ اُن کو درجۂ کمال تک پہنچانا چاہتا ہے - انسان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے نفس کو پامال کر دے اور تکمیل سے اُسے محروم رکھے — قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰٮهَا ۙ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰٮهَا ؕ

کامیاب ہو گیا جس نے اُسے (اپنے نفس کو) نکھارا - اور ناکام ہوا جس نے اُسے دبایا اور خراب کیا -

(۹۱: ۹—۱۰)

انسان کی تکمیل حقیقت میں اپنے رب کی طرف بڑھنے ہی سے ہوتی ہے، خدا سے بے نیاز اور بیگانہ ہو کر انسان پستی میں جا گرتا ہے اور کامیابی کے بلند مرتبے پر پہنچنے سے قاصر رہ جاتا ہے - اسلام نے اس کی پوری وضاحت کر دی ہے کہ انسان اپنی تکمیل کے لیے دُنیا کے آزمائشی دور میں کون سا طرزِ عمل اختیار کرے - اس سلسلہ میں اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس سے فرد ہی نہیں، جماعت، قوم اور پوری انسانیت ترقی کی طرف بڑھ سکتی ہے اور لوگ ایک دوسرے

کی تکمیل میں مزاحم ہونے کے بجائے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہاں اس خوشی (PLEASURE) کی بھی نفی نہیں کی گئی ہے جس کا ذکر اخلاق کے منکرین کے یہاں ملتا ہے، لیکن اس کے ساتھ اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ خدا کی رضا کی طلب اور اس کے لیے سعی و جہد اور اس کے دیئے ہوئے قانون کی پیروی بذاتِ خود سب سے بڑی خوشی کی چیز ہے۔ اسلام ذہن و دماغ اور دل کی ضرورتوں کو نظر انداز نہیں کرتا، بلکہ وہ انسان کے سارے ہی جذبات اور اس کی خواہشات کا احترام کرتا ہے، البتہ وہ اسی خوشی کو سندِ جواز عطا کرتا ہے، جو فطری اور احکامِ خدا کے تحت ہو۔ اخلاقی فرائض کی انجام دہی میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے اُسے تو اسلام نے دین و ایمان کی علامت تک قرار دیا ہے، چنانچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

إِذْ سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ	جب تمہیں اپنے اچھے کام کی خوشی ہو،
وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ	اور اپنے بُرے کام سے تکلیف اور
فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ۔ (احمد)	افسوس ہو تو تم مومن ہو۔

خوشی خواہ ذہنی ہو یا روحانی اور جمالیاتی۔ اگر اس خوشی اور دینی قدروں کے درمیان کوئی تصادم نہ ہو تو وہ معتبر ہے۔ اسلامی نظامِ حیات میں بھی اس کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ فرد کی خوشی اور جماعت اور پوری انسانیت کی خوشیوں کے درمیان کوئی تضاد و تصادم پیدا نہ ہو۔

خدائی ہدایت کے ذریعے جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہی اصل علم ہے۔ دوسرے علوم خواہ وہ تجرباتی ہوں یا وجدانی، ان کی حیثیت اصل علم کے شواہد کی ہے۔ اخلاقیات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ قوانینِ حیات، عقل و وجدان اور انسان کے تجربات سب کے سب خدائی ہدایت کے حق اور خیر ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ اصل معیار خدا کی ہدایت ہے۔ حکماء کی تجویز کردہ چیزوں کی اس سے نفی نہیں ہوتی، بلکہ اس سے ان کی تصحیح و تکمیل ہوتی ہے۔ ان میں سے اگر کوئی چیز غلط حدود میں پہنچ گئی ہے تو خدا کی ہدایت میں اُسے ایک جامع نظام کے اندر اس کے اپنے ٹھیک مقام پر رکھا گیا ہے۔

یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ اسلام میں اخلاق صرف جنت اور دوزخ کے تصور پر مبنی ہے۔ جنت اور دوزخ کا تصور اخلاق کی اصل اساس نہیں ہے، بلکہ یہ اخلاق کے آخری نتائج ہیں۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر کسی سے کہا جائے کہ کسی کا مال ہڑپ کرو گے تو جیل جانا پڑے گا، تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس کام کی برائی قید خانے پر مبنی ہے۔ خود اس فعل میں کوئی برائی نہیں۔ اسی طرح اگر کسی سے کہا جائے کہ سچائی اختیار کرنے والے کو سوسائٹی میں عزت کا مقام حاصل ہوتا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب لینا صحیح ہو سکتا ہے کہ سچائی کی اساس مقامِ عزت کا حصول ہے، سچائی اپنے اندر کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی؟

قرآنِ حکیم نے خیر و شر کا ایسا نظریہ پیش کیا ہے جس کی بلندیوں کا تصور بھی عام ذہن نہیں کر سکتا۔ قرآن خیر کو "معروف" کہتا ہے یعنی اس کے نزدیک خیر وہ ہے جس سے انسان کی فطرت مانوس ہے۔ جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ جسے وہ پہچانتی ہے۔ شر کو قرآن "منکر" کہتا ہے، یعنی شر اس کے نزدیک وہ ہے جس سے انسان کی فطرت ابا کرتی ہے۔ جو انسانی فطرت کے لیے اجنبی ہے۔ جس کو وہ جانتی نہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام میں نیکی و بدی کی اساس انسانی فطرت پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک نیکی یہ ہے کہ فطرت کے مطابق ٹھیک ٹھیک چلا جائے۔ مطلوب یہ ہے کہ انسان ترقی کر کے اس مرتبے کو پا لے جہاں دین کی کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف نظر نہ آئے، سب کچھ اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہو۔ جنت کی تعریف میں قرآن میں فرمایا گیا ہے:

لَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۔ (۴۱ : ۳۱)	تمہارے لیے وہاں وہ سبھی کچھ ہے جو تمہارا جی چاہے اور وہاں تمہارے لیے وہ سبھی کچھ ہے جس کی طلب تمہارے اندر ہو۔

اسلامی نقطۂ نظر سے فطرت کے خلاف عمل کرنے کا نام بدی ہے۔ اور اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ آدمی تنزل اور گراوٹ کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں کوئی چیز مرغوب اور

پسندیدہ نہ پائی جائے۔ جو کچھ بھی ہو اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ جہنم ایک ایسا ہی مقام ہے، جس تک آدمی کو اس کی اخلاقی گراوٹ ہی پہنچاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاق کی اصل بنیاد انسان کی اپنی فطرت کی پہچان اور اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اخلاق کوئی خارجی شے نہیں، بلکہ وہ فطرتِ انسانی کا صحیح اظہار ہے۔ انسان اگر اپنے حقیقی جذبات و احساسات کو پہچان لے تو اخلاقی تقاضے اس کے اپنے دل کی اُمنگوں سے مختلف کوئی چیز نہیں ہیں۔ جب تک انسان اپنی حقیقی فطرت سے آشنا نہیں ہوتا وہ بُرائی سے خواہ بچ بھی جائے مگر اس کے دل و دماغ بدستور گنہگار رہیں گے۔

آدمی کی جیسی شخصیت ہوتی ہے اس سے اعمال کا صدور بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ کسی عمل کے پیچھے صرف جبلی تحریک (MOTIVE) ہی کا دخل نہیں ہوتا، اس میں اس کا ذہن و فکر اور اس کی عقل بھی کام کرتی ہے۔ اس کے پیچھے اس کے آئیڈیل اور مقصدِ حیات کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے، جس کو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اختیار کیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس پہلو سے اخلاق و کردار زندگی کا کچھ حصہ یا ارنلڈ (MATHEW ARNALD) کے خیال کے مطابق تین چوتھائی ہی نہیں ہوتا، بلکہ فطری طور پر وہ اس کی پوری زندگی پر حاوی ہوتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے بعض ایسی غیبی چیزیں بھی اخلاق کے لیے محرکات کا کام کرتی ہیں جن کا احساس عام طور پر لوگوں کو نہیں ہوتا۔ آدمی جب اپنی زندگی کو عالمِ غیب و بسیط سے جو عالمِ حقیقت ہے، ہم آہنگ کر لیتا ہے تو خدا کی طرف سے اُسے تائید و مدد حاصل ہونے لگتی ہے۔ اُسے علم و حکمت سے نوازا جاتا ہے۔ اُسے طمانیت اور سکینت حاصل ہوتی ہے۔ فرشتے بھی اس کے دل میں نیک خیالات و احساسات القا کرنے لگتے ہیں اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ خدا کی ایک اعلیٰ اور معصوم مخلوق کی معیت بھی اُسے حاصل ہے۔

انسانی حیات میں اخلاق کا نمایاں اظہار حقوق کی ادائیگی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے انسان پر سب سے پہلا اور سب سے بڑا حق اس کے خالق و مالک خدا کا ہے۔ خدا کے حقوق کی ادائیگی میں اس کی عبادت، پرستش، اطاعت وغیرہ ساری ہی چیزیں داخل ہیں۔ خدا کے بعد بندگانِ خدا کے حقوق ہیں، جن سے اس کے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔

خدا کے بندوں میں سب سے نمایاں حق والدین کا ہوتا ہے کیونکہ والدین سے انسان کا تعلق انتہائی قریبی اور گہرا ہوتا ہے۔ پھر درجہ بدرجہ دوسرے لوگوں کے حقوق سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ تفصیل قرآن کی اس آیت میں ملتی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۔ (۴:۳۶)	اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، والدین، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، پڑوسی، رشتہ دار اجنبی، ہمسایہ، پہلو کے ساتھی، مسافر اور جو تمہارے زیر دست ہوں، سب کے ساتھ نیک سلوک کرو، بلاشبہ اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا، جو مغرور اور ڈینگیں مارتا ہو۔

اس آیت میں والدین، اعزہ اور دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیتے ہوئے خدا کی بندگی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں اس بات کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس طرح والدین، رشتہ داروں وغیرہ کے ساتھ نیک برتاؤ انسان کے لیے ایک اخلاقی اور فطری بات ہے، ٹھیک اسی طرح خدا کی اطاعت و بندگی کا مطالبہ بھی ایک فطری مطالبہ ہے، جس کا اخلاقِ انسانی سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں طرح کے حقوق کی ادائیگی میں ایک ہی بنیادی اخلاقی اصول کام کرتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے صرفِ نظر کرنا اس بنیادی اصول کی تردید کے ہم معنی ہے اور اس سے انسان خود اپنے اخلاق و کردار کو بھی صدمہ پہنچاتا ہے۔ بنیادی اخلاقی اصول زندگی کے تمام ہی شعبوں میں کام کرتا ہے خواہ زندگی کا سیاسی شعبہ ہو یا معاشی۔

اِن تفصیلات کی روشنی میں اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اخلاقی فرائض کی ادائیگی محض کسی خارجی قانون کی پیروی کا نام نہیں ہے اور نہ ہی یہ آدمی کا کوئی ایسا ایثار ہے جو کسی اجنبی (AFIEN) طاقت کے لیے ہو، بلکہ بعنوان اجزائے حیات کی فطرت

کے ساتھ ہمارے محض ہم آہنگ ہو جانے کا اظہار ہے جس سے انسانی شخصیت کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے، چنانچہ افلاطون (PLATO) نے کہا ہے:

VIRTUE WILL BE A KIND OF HEALTH AND BEAUTY AND GOOD HABIT OF THE SOUL: AND VICE WILL BE A DISEASE AND DEFARMITY AND SICKNESS OF IT.

"نیکی کو صحت اور حسن کی ایک قسم اور روح کی ایک اچھی فطرت کہا جائے گا۔ اور گناہ کو مرض اور روح کا بگاڑ اور اس کی بیماری قرار دیں گے"[1]

سچ ہے، نیکی کی تلاش اور گناہوں سے اجتناب بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی صحت کا طالب اور بیماری سے بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

---

[1] G. LOWES DICKINSON

مطبوعات

اقبال اور جدید دنیائے اسلام | جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل ناشر: مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، اُردو بازار، لاہور۔ اُجلی اُجلی جدید طباعت اور پروقار جلد و گردپوش کے ساتھ ۳۰۹ صفحات قیمت: ۷۵/- روپے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل اب ادبی تحقیقات کے دائرے میں اتنا کام کر چکے ہیں کہ ان کا نام اچھے معیارِ کار کی ضمانت ہے۔ اس کتاب کی نوعیت وہ نہیں جو عام طور پر علامہ اقبالؒ کے کسی فنی پہلو، کسی خاص نظریے، یا شخصیت و سوانح کے متعلق سامنے آتی رہتی ہیں۔ ان کی افادیت اپنی جگہ، لیکن ڈاکٹر عقیل نے اقبال کو بڑے وسیع تاریخی ماحولی کینوس میں رکھ کر پیش کرتے ہوئے متعدد ذمہ داریاں اپنے سر لی ہیں۔ اور یہ کام کسی نہ کسی کو جامع شکل میں کرنا ہی تھا۔ جستہ جستہ مختلف پہلوؤں پر اوروں نے بھی جا بجا لکھا ہے۔ مگر پورے عالمِ اسلام (خصوصاً جدید دَور کو) پیشِ نظر رکھ کر اقبال کو سمجھنے سمجھانے کی کوئی موثر و وقیع کوشش نہیں کی گئی۔ حالانکہ اقبال کی شاعری کی معنوی رُوح کا اصل سرچشمہ اسلام ہے اور وہ جدید یا معاصر عالمِ اسلام کے احوال کے مدّوجزر کے ساتھ ساتھ فکر و فن کے قدم آگے بڑھاتا ہے۔ حتٰی کہ اگر ڈاکٹر عقیل کی مدد کے بغیر بھی کوئی بے تعصب حقیقت پسند صاحبِ مطالعہ بآسانی مسلمانانِ عالم کے واقعات و احوال کے ساتھ علامہ کی غزلیں اور نظمیں اور مثنویاں رکھ کر دکھا سکتا ہے کہ کس صورتِ حال نے ہمارے ملّی شاعر کے اندر کس نوع کا تلاطم پیدا کیا۔ اور اس کا اثر کب تک چلا اور پھر اس میں کوئی موڑ آیا تو کب آیا اور کوئی دوسری چیز چھا گئی تو وہ کدھر سے نمودار ہوئی۔

اقبال شناسی جیسے اقبال فہمی کی اصطلاح کی جگہ ہم نے ایرانی لٹریچر سے اخذ کیا۔ اس کی راہ

ہیں اپنی نہج سے یہ ایک مکمل اقدام ہے جو ہمارے سامنے آیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جس شخص نے اسلام، عالمِ اسلام اور اس کی جدید تحریکات اور مسلم معاشروں میں مغربی امپریلزم اور فلسفۂ تہذیب کی پیدا کردہ کشمکش اور اس کی مزاحمتی مساعی کو نہ سمجھا تو وہ کسی بھی طرح اقبال شناسی کے صحیح مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرا مدعا بعض دوسرے اہم عناصر کی قدر و قیمت کا انکار کرنا نہیں ہے مگر جو بات میں نے کہی ہے وہ تو اقبال فہمی کی ایک اہم شرط ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل کے کام کی پیچیدگی یہ ہے کہ وہ کلامِ اقبال میں جگہ جگہ سے خاص عنوانات، ضروری حوالے اور اشارے، شخصیتوں کا ذکر، واقعات کی تلمیحات، بعض مقولے، کچھ خاص طرح کے انداز ہائے بیان، کہیں نہایت اُبھری ہوئی صراحتیں اور کہیں کنایتیں ذہن میں جذب کر کے پھر ان کا جوڑ "عالمِ اسلام کے مسائل، افکار اور تحریکات" سے ملا کر دیکھتا ہے تو یہ کھُلتا ہے کہ کلامِ اقبال تو ایک اچھا خاصا آئینہ ہے جس میں مسلمانوں کے دکھ اور کرب اور ان کے عزائم اور اُمیدوں کے عکس جھلملاتے ہیں اور پھر ان کے ساتھ ساتھ علامہ کے اپنے افکار، احساسات اور جذبات نشو و نما پا کر رنگا رنگ فنی گلدستے پیش کرتے ہیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارے دَور کے ایک نوجوان محقق نے تحقیق کا ایک بہت اچھا معیار قائم کیا ہے اور اپنے دعووں کے ساتھ دلائل اور حوالوں کے لشکر کھڑے کر دیے ہیں۔ انھوں نے بڑی عرق ریزی سے وہابی تحریک، شاہ ولی اللہ تحریک، سنوسی تحریک، علی گڑھ تحریک، سید جمال الدین افغانی کی تحریک (اتحاد اسلامی)، تحریکِ خلافت، ترکی میں انہدامِ خلافت اور تحریکِ تجدد کا ظہور، وطنی قومیت اور مغربیت کا مسئلہ، مسئلہ فلسطین، اشتراکیت کا مسئلہ، اور دیگر شخصیات و تحریکات کا اقبال کے کلام کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ جائزہ حقیقت پسندانہ ہے اور تاریخ کا چہرہ اپنے کسی خاص نقشے سے مطابق کرنے کے لیے بگاڑا نہیں گیا۔ سہوِ نظر اور سہوِ قلم کا ہونا معاملہ دیگر ہے۔ بس ان ساری داستانوں کو پڑھتے ہوئے عالمِ اسلام کا اصل قضیہ صرف ایک دریافت کر سکا ہوں۔ وہ ہے، لادینیت پسند اور مادہ پرست مغرب کے اقتدار، دولت، کلچر، ڈپلومیسی، خدا ناشناس علوم اور پروپیگنڈے کے زور سے مُسلم معاشروں کو خدا پرستانہ طرزِ حیات اور نقشۂ تہذیب سے ہٹا کر فکری، تہذیبی،

اور سازشی لحاظ سے اپنی غلامی میں جکڑنا اور بین الاقوامی بساطِ مفاد پر شکستوں پر شکستیں دینا تاکہ مسلمان قومیں سر نہ اُٹھا سکیں ۔ اسی شعور کے ساتھ اقبال عہدِ حاضر کے خلاف جنگ کا اعلان کرتا ہے ۔ اسی جنگ کے لیے ایک محاذ بنانے کا خیال تصورِ پاکستان کی صورت میں علامہ کے ذہن میں اُبھرا ۔

ترکی اور مصر کے متعلق میں نے نہایت غور سے ڈاکٹر عقیل کا محاکمہ پڑھا ہے ۔ انھوں نے اُصول پسندی اور اباحت پسندی، تجدید اور تجدد یا اسلام اور سیکولرازم کے دونوں پہلوؤں میں جو موجیں تاریخ میں اُٹھتی دیکھیں ان کو متقابلاً پیش کر دیا ہے ۔ اس پہلو سے بھی جانب داری کا مقام تھا جو آج کل کے بہت سے دانشوروں میں رائج ہے ۔ اگر ڈاکٹر عقیل حقیقت بیانی کے پل صراط پر سے بخیریت گذر گئے ہیں ۔ اگرچہ بعض جگہ تشنگی محسوس ہوئی کہ بات جتنی کھلنی چاہیے تھی نہیں کھلی ۔ راسخ العقیدہ اسلامیت (+ اجتہاد) اور تجدد و اباحیت کے دوگونہ رجحانات کے مختلف تناسب زیادہ واضح ہونے چاہییں تھے تاکہ ہم اقبال کا اس تاریخ کشمکش میں صحیح ترین مقام معین کر سکتے ۔ اور اقبال کی فکر کو غلط مفہوم دینے کی کوششوں کا اس کتاب کے ذریعے زیادہ زوردار دفاع کر سکتے ۔

اِس مجبوری کے تحت کہ ترجمان القرآن میں تبصروں کے لیے زیادہ جگہ میرے تصرف میں نہیں ہے ۔ معذرت کرتا ہوں کہ نہ تو میں نشان زدہ حصوں کو زیرِ بحث لا سکا اور نہ بعض اہم عبارات کے اقتباس درج کر سکا ۔

مَیں اس کتاب کو اقبالیات کے دائرے میں بہت مفید، موثر اور دلچسپ پاتا ہوں اور بڑی خواہش ہے کہ اقبال شناسی کی راہ کے مسافر ضرور اسے شمعِ راہ بنائیں ۔ خواہ وہ دانشور اور صحافی ہوں، ادیب اور شاعر ہوں، استاد اور طالب علم ہوں یا سیاسی لیڈر اور مذہبی اکابر ۔

ECONOMIC CONCEPTS OF IBN TAIMIYAH	ترجمہ عنوان : امام ابن تیمیہ کے اقتصادی نظریات ۔ تحقیق و ترتیب : جناب عبدالعظیم اصلاحی ۔ انگریزی میں لکھی

ہوئی کتاب، مغربی معیارِ طباعت و اشاعت و ڈیزائن و ٹائٹل کے ساتھ ۔ ناشر: دی اسلامک فاؤنڈیشن، ۲۲۳ ۔ لندن روڈ ۔ لائسسٹر ۔ یوکے ۔ قیمت معلوم نہیں ہو سکی ۔

حضرت امام ابن تیمیہ کی عظمت مآب درخشاں شخصیت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ان کے تاریخی مقام کو دیکھنے سے ہو سکتا ہے جہاں کئی قسم کے چیلنج انہیں درپیش تھے۔ اسلامی نظامِ حکومت کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں طرح طرح کے آفت و عبرت کے جو دور آئے، ان میں سے ایک اہم دور امام ابن تیمیہ کا تھا۔ مسلمانوں کے سر سے منگولی طوفان گزر چکا تھا۔ صلیبی جنگوں کی قیامت خیزی دیکھی جا چکی تھی۔ فکری لحاظ سے ہندی، ایرانی کلچر کے ساتھ ساتھ یونانی علوم و افکار بھی پھیلے ہوئے تھے۔ اور مشرق و مغرب میں رابطہ بڑھنے کی وجہ سے زندگی کے ہر معاملہ میں نئے سوال اور نئے تصورات پیدا ہو رہے تھے۔ اس زلزلہ و سیلاب کے دور میں جس شان سے امام ابن تیمیہ نے اپنے ذہنی جہاز کے توازن کو بحال اور اپنے ایمانی پرچم کو سربلند رکھا وہ بے شمار دوسرے انسانوں کے لیے مثال بن گیا۔

بھارت کے حالات مسلمانوں کے لیے چاہے کتنے تکلیف دہ رہے ہوں مگر ان میں علمی و تحقیقی ذوق کو نشوونما پانے کا خوب موقع ملا۔ اس کا تازہ ترین ثبوت زیرِ نظر کتاب ہے۔ جس کی تیاری میں تحقیق کا حق بھی ادا کیا گیا ہے۔ اور لکھنے میں دلنشینی اور کشش کی خوبی بھی رکھی گئی ہے۔ نہایت اچھی انگریزی میں (کاغذ، ٹائپ، ٹائٹل سب خوب!) امام ابن تیمیہ کی دوسری وسیع تر خدمات سے الگ کر کے ان کے اقتصادی نظریات و مسالک کو ابواب و فصول کی اچھی تقسیم کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ منصفانہ قیمت، مارکیٹنگ سسٹم، ملکیتِ جائیداد کے حقوق، نقدی اور سود، حصہ داری اور اقتصادی منظمات، اقتصادی زندگی میں ریاست کا حصہ، مالیاتِ عامہ، اپنے دور کے اقتصادی نظریات و تصورات کا جائزہ، جیسے موضوعات پر امام ابن تیمیہ نے بڑی بالغ نظری سے اس دور کے لوگوں کی رہنمائی بھی کی اور بعد والوں کے لیے بھی راہیں بنا دیں۔ عبدالعظیم صاحب نے زمانے سے منوا لیا کہ ہمارے اسلاف میں سے یہ ہستی ماہر اقتصادیات تھی۔

امام ابن تیمیہ صوفی نقطہ نظر کے خلاف مفلوک الحالی پر دولت کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک دولت اچھی خوشگوار اخلاقی زندگی بسر کرنے کا وسیلہ ہے — لیکن دولت کو ایک خادمہ ہونا چاہیے نہ کہ انسان کی مالکہ۔ (ص ۱۱۸)

امام ابن تیمیہ کا فلسفۂ اقتصادیات حکومت کے حوالے سے جو تصور دیتا ہے وہ سلطانِ وقت کو لکھے ہوئے ایک خط کے اقتباس سے ظاہر ہے ۔ انہوں نے سلطان کو ترغیب دلائی کہ وہ بھوک کے خلاف لڑیں ۔ لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری کریں ۔ کچلے پسے لوگوں کی مدد کریں ۔ مصیبت زدہ لوگوں کی فریادیں سنیں ۔ اور نیکی کے احکام دیں اور بدی کا سدِ باب کریں ، کیونکہ یہ چیزیں امام کے نزدیک انصاف اور نیکی کی زندگی کے ستون ہیں ۔ (ص ۶۵)

امام کے فتاویٰ کے وسیع ذخیرے میں سے اقتصادی مسائل کی بعض ایسی صورتیں سامنے لائی گئی ہیں کہ جو اس بات کی گواہ ہیں کہ امام کے نزدیک اجتہاد گہرے علم اور تحقیقِ احوال کے بل بوتے پر شریعت کے جوہر کو نئے حالات میں محفوظ کرنے کا کام تھا ۔ آج کل تو اجتہاد دانشوروں کا ایک انڈور گیم بن گیا ہے ۔ امام کی مثالیں ہمارے موجودہ حالات و مسائل پر بھی چسپاں ہوتی ہیں اور بڑی وسیع رہنمائی ملتی ہے ۔ واضح رہے کہ شرک و بدعات کی طرح سُود اور بیوعِ فاسدہ وغیرہ کے بارے میں امام کا نظریہ بڑا سخت ہے ۔ زمانے کے فتنے اور حادثات ان کے اعصاب کو ڈھیلا کرنے کے بجائے کسنے کا باعث ہوئے ۔

جو کچھ میرے نوٹس تھے اور جو کچھ لکھنے کو جی چاہتا تھا اس کی گنجائش نہیں ۔ مختصر یہ کہ اساتذہ و طلبائے اقتصادیات و مصنفین و محققین کو یہ کتاب ضرور حاصل کرنی چاہیے ۔

رُوس کے مسلمان | از جناب ثروت صولت ۔ باہتمام ادارہ معارف اسلامی کراچی ۔

ناشر : مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار ، لاہور ۲ ۔ مجلد ۲۸۶ صفحات ، قیمت -/۳۹ روپے

یہ کتاب کا دوسرا حصہ ہے جس کی نوعیت تاریخ کی ہے ۔ ثروت صولت صاحب تاریخ کا خاص ذوق رکھنے کے ساتھ ترکی اور فارسی اور بعض دیگر زبانوں کو جانتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے لئے دل دردمند رکھتے ہیں ۔ اس لئے روسی مسلمانوں کے متعلق ان کی لکھی ہوئی کتاب کی بڑی اہمیت ہے ۔

تعلیم ، آزادی اور جمہوریت اور انسانی حقوق ، انسانیت دوستی ، عقلیت اور رواداری کے اس دور میں جتنے زیادہ مظالم ہوتے ہیں اور خاص طور پر مسلمانوں کو جن بھاری تصادموں

اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جگہ جگہ جاری ہے اور عالمگیر سٹیج پر اس کا ایک بڑا ہولناک نمونہ افغانستان پر روسی چڑھائی اور انسان کشی ہے۔ اس کے پیش نظر منور حسن صاحب (ابتدائیہ ص ۵) کے یہ الفاظ کتنے صحیح ہیں کہ "خوشنما لباسوں سے مزین جسم اور زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور چہرے لیکن اندر بھیڑیے کا دل رکھنے والے انسانوں کا تسلط"۔

اسلام جب عبارت تھا نور کی لہروں سے اور بالعموم فضائے عالم میں تعصب کی رکاوٹیں اس کے لئے حائل نہ تھیں تو دریائے وانگا اور کاما کے سنگم پر جو ترک پہلی صدی عیسوی سے آباد تھے ان میں اسلام چوتھی صدی ہجری میں پھیلنا شروع ہو گیا (ص ۱۹۸) تفقاز کے شمال میں بلغار کے نام سے روس میں پہلی اسلامی مملکت (۹۰۰ء کے بعد) قائم ہوئی۔ دلچسپ بات یہ کہ مسکو یا ماسکو بہت ہی گمنام اور معمولی ریاست تھی۔ شروع میں بڑی ریاست کیو (یوکرائن) کی ریاست تھی۔ ماسکو کے حکومتی شہر کی آبادی پانچ ہزار گھروں پر مشتمل تھی۔ پہلی بار ماسکو کا تذکرہ ۱۱۴۷ء میں سنا گیا (ص ۲۲۷) منگولوں کے پہلے ہی حملے میں یہ باجگذار بن گئی اور ڈیڑھ سو سال تک سرانگندہ رہی۔ لیکن پہلے زار شاہی نے اور پھر اسی نقشے پر کمیونسٹوں نے روسی سلطنت کی توسیع کی۔ ملاحظہ ہو سال وار توسیع کا نقشہ (ص ۲۷۰)۔ برصغیر میں اکبر کے اقتدار پہ آنے کے ساتھ روسی زار شاہی نے کریمیا اور قفقاز کے علاقوں کو چھوڑ کر پورے روس میں مسلمانوں کی حکومتیں ختم کر دیں (۲۰۷)

کمیونزم نئے فلسفے، نئے نعروں اور نئے انقلابی نقشے کے ساتھ جب اٹھا تو اچھے اچھوں کی ہستی گم ہو گئی۔ کوئی نئی امیدوں سے اور کوئی خوف سے مارا گیا۔ ہمارے نوجوان اس دور میں بہت مفتوح ہوئے جبکہ راقم ابھی بلوغ کو بھی نہ پہنچا تھا لیکن مجھے اولاً تو میرے دین نے بتا دیا کہ راہِ ہدایت سے بنے ہوئے نظام اور توڑ پھوڑ دکھاتے نظریے اور ظلم و جبر سے قائم ہونے والی ریاستیں بنیادی طور پر جھوٹ ہیں۔ پھر خود میں نے جب کارل مارکس اور کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ اور روس کا پروپیگنڈہ لٹریچر پڑھا تو میری آنکھیں اور بھی کھلیں، یہاں تک کہ اب افغانستان کے سٹیج پر تو اپنے سامنے سوویٹ روس کا وہ خونخوارانہ کردار

دیکھا کہ جو اس کے نظریات کی صحت کی کامل تردید کو کافی ہے۔

بہر حال یہ حقیقت خوش آئند ہے کہ روحوں میں سب سے زیادہ گہرائی تک جڑیں اتارنے والا شجرۂ طیبہ صرف اسلام کا ہے۔ اتنی لمبی تاریخ ظلم کے گزرنے، زبانوں اور رسم الخط کو بدل دینے، مختلف نسلوں کو دور دراز کے علاقوں میں بکھیر دینے اور اسلام کے نہایت ہی اہم وظائف و ظواہر کو کلیتاً مٹا دینے کے بعد روسی مسلمانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اب بھی چنگاریاں سلگ رہی ہیں جن کی آگ اگر پھیلی تو نہ صرف روس کو بھسم کر دے گی، بلکہ پوری دنیا کا نقشہ ایک بار بدل جائے گا۔

اس کتاب میں اہم شخصیتوں، تاریخی عمارتوں، شاعروں اور ادیبوں، رزمیہ داستانوں بعض سفرناموں، دینی علماء کے گراں بہا کارناموں اور دیگر علوم و فنون کے ماہرین کا بھی تذکرہ ہے اور یہ بہت مفید۔

اُردو ڈائجسٹ سالنامہ اور رحمۃ للعالمین نمبر

مدیر جناب الطاف حسن قریشی - دفتر: ۲۱ ایکڑ اسکیم سمن آباد لاہور ۲۵ - ضخامت: تقریباً چار سو صفحات - قیمت: ۱۸ روپے

مادیت کے سیلاب بلا کا یہ عہد جس کی وجہ سے سر جھکائے ہوئے ہیں، ضمیر پس رہے ہیں، روایات پامال ہو رہی ہیں اور ہماری عزیز قدروں کے چراغ گل ہو رہے ہیں۔ اس میں ہمارے لیے اگر کوئی کشتی نوح ہو سکتی ہے تو وہ نبی اکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے۔ طاغوتی قوتوں کے خلاف لڑائی لڑنے کے لیے سیرتِ پاک ہمیں بہترین اصولی و اخلاقی اسلحہ خانہ مہیا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں رمضان کے ماہ سعید کے قرب میں اُردو ڈائجسٹ نے عام سالنامے کے بجائے رحمۃ للعالمین نمبر پیش کر کے بڑا نیک کام کیا ہے۔

اس نمبر میں حضور پاک کی دعائیں اور فرمودات بھی ہیں۔ آپ کے نمونہ ہائے عدل گستری بھی ہیں۔ پھر سیرتِ مطہرہ کے خاص خاص ابواب ہیں، سوالوں کے جواب میں مختلف ادیبوں اور دانشوروں کے سبق آموز افکار ہیں۔ خواتین اور عورتوں اور بچوں اور محنت کشوں کے لیے سرمایہ تسکین بھی مہیا ہے۔ نمبر کی نعتیں اور منظوم تاثرات بڑا ادبی سرمایہ ہیں۔

بس غیر مسلموں خصوصاً مستشرقین کی طرف سے حضورؐ کی جو مدح سرائی نقل کی گئی ہے۔ ایک زمانے میں اس کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی، مگر اب جب کہ بہت سے حقائق فاش ہو چکے ہیں، ان حوالوں کا استعمال کرنا ہمیں کوئی نئی قوت اور نیا سرمایۂ اعتبار نہیں دیتا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی مدح یہ ہے کہ آپ کے تعلیم کردہ دین و اخلاق کو اپنا کر اُسے پھیلانے اور پھر غالب قوت بنانے کی سعی کی جائے۔

آخر میں ہم اُردو ڈائجسٹ کو اس درخشاں خدمت پر مبارک باد کہتے ہیں۔ اور دل سے چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ قارئین، خصوصاً نوجوان اسے پڑھیں۔

ساندل بار از جناب احمد غزالی۔ ناشر: فیروز سنز، لاہور، راولپنڈی، کراچی۔ کمپیوٹرائزڈ نفیس طباعت، دبیز سفید کاغذ، مضبوط آرٹ کارڈ پر رنگین دبیز ٹائیٹل۔ ص ۳۰۹۔ قیمت: ۹۰/ روپے۔

مؤلف نے تصنیف و تالیف کا نیا راستہ نکالا ہے۔ یعنی ایک علاقے (ساندل بار) کی جغرافی، نسلی، اقتصادی، تہذیبی، ادبی اور لسانی تاریخ نئے انداز سے لکھی ہے۔ وہ پہلے چولستان کا "لوک مکھڑا" دکھا چکے ہیں۔ اب وسطی پنجاب کے اس شاداب قطعۂ زمین کی علاقائی تفاصیل کی تحقیق بہ عنوان ساندل بار مرتب کی ہے جو راوی اور چناب کے دوآبے میں واقع ہے۔ بابا گرو نانک کا مولد، حضرت سلطان باہو کا مدفن، شاعر وارث شاہ کا زادبوم، شاہجہان کے وزیر نواب سعد اللہ خاں کا مطلعِ وجود، سورما دلّا بھٹی، رائے احمد خاں کھرل اور مراد فتیانہ کی سرزمین فخر بھی یہی ہے۔

مؤلف کے کمالِ تحقیق کی داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا جس نے ۶ برس کی گرد آوری خطہ (FIELD RESCERCH) کے نتیجے میں ساندل بار کی ساری لوک ریت ہماری نظروں کے سامنے پھیلا دی ہے۔ اس نے علاقے کی تاریخ، ثقافت، عمرانیات، وہاں کی شخصیتوں، کھیلوں، کہانیوں، کہاوتوں، گیتوں، پیشوں، دستکاریوں، معالجات اور

رسم و رواج کے تمام وہ پہلو دکھا دیئے ہیں جن سے زندگی تشکیل پاتی ہے۔
مولانا نور احمد نقشبندی کی حریت پسندانہ لقاریہ اور گرفتاری کا قصہ بڑا اثر انگیز ہے (ص ۱۰۴)
"قومیں" کے عنوان سے برادریوں اور خاندانوں کا نسلی تذکرہ معلومات افزا ہے۔ (ص ۱۰۰ تا ۱۳۲) اولیائے کرام کا بیان بھی خوب ہے (ص ۱۴۱ تا ۱۶۹) - زیورات کی تفصیل پڑھ کر حیرت ہوئی - (ص ۱۹۳ تا ۱۹۷) - سانپوں کے بیان کا تو کہنا ہی کیا ، دس گیارہ اقسام کی تفصیلات درج ہیں - (ص ۲۰۱ تا ۲۰۴)
خیال رہے کہ کتاب کا سارا مواد تاریخی کے ساتھ ساتھ روایاتی عنصر بھی رکھتا ہے۔
مجھے بڑی اچھی لگی، احمد غزالی بات کہ "لوک روایات ایک میٹر اور معیار ہیں جن کے توسط سے ہم کسی معاشرے ہیں کثیر آبادی سے روا رکھے جانے والے سلوک کا جائزہ لے سکتے ہیں"

تنقید و تاریخ ادب مرتبہ: جناب تحسین فراقی - نظرثانی ڈاکٹر انور سدید۔
ناشر: نیشنل بک کونسل آف پاکستان - ۱۲۰ ریواز گارڈن، لاہور (ہیڈ آفس اسلام آباد)
یہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۲ء تک پاکستان میں شائع ہونے والی اردو کی ایسی کتابوں کی جامع فہرست ہے، جن کا تعلق تنقیدِ ادب اور تاریخ ادب سے ہے۔ کسی بھی زبان میں تحقیق کا کام کرنے کے لیے مختلف موضوعات پر ہر دور کی کتابوں کی عنوان وار فہرستیں موجود ہونی چاہئیں۔ تاکہ آسانی سے کسی ضرورت کے لیے (BIBLIOGRAPHY) تیار کی جا سکے۔ اس سلسلے کے کچھ کام پہلے اردو میں ہوتے ہیں۔ اور یہ تازہ اضافہ نہ صرف بجائے خود مفید ہے، بلکہ آئندہ کے لیے نیشنل بک کونسل کو اچھی امیدوں کا مرکز بناتا ہے۔
